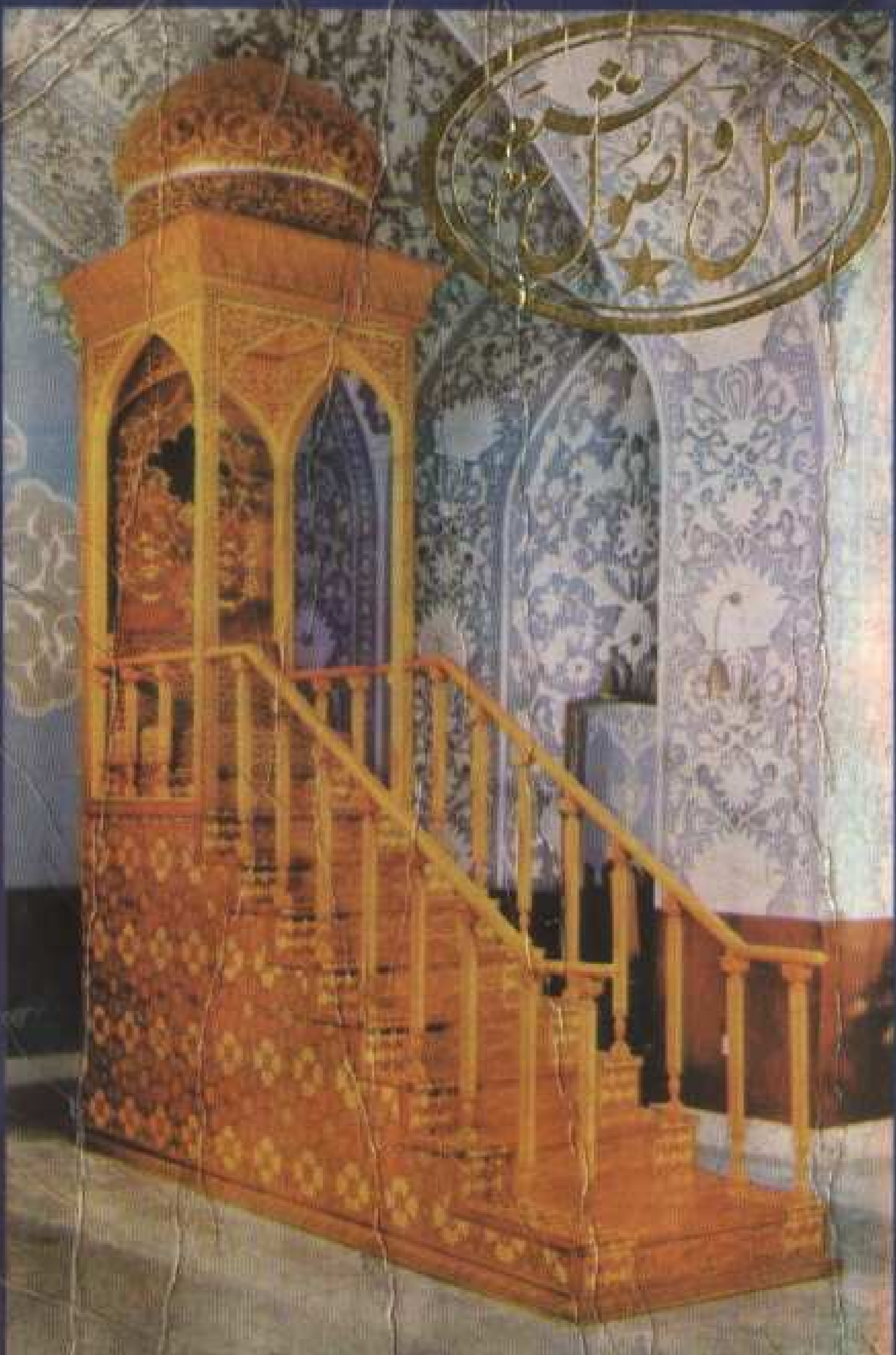
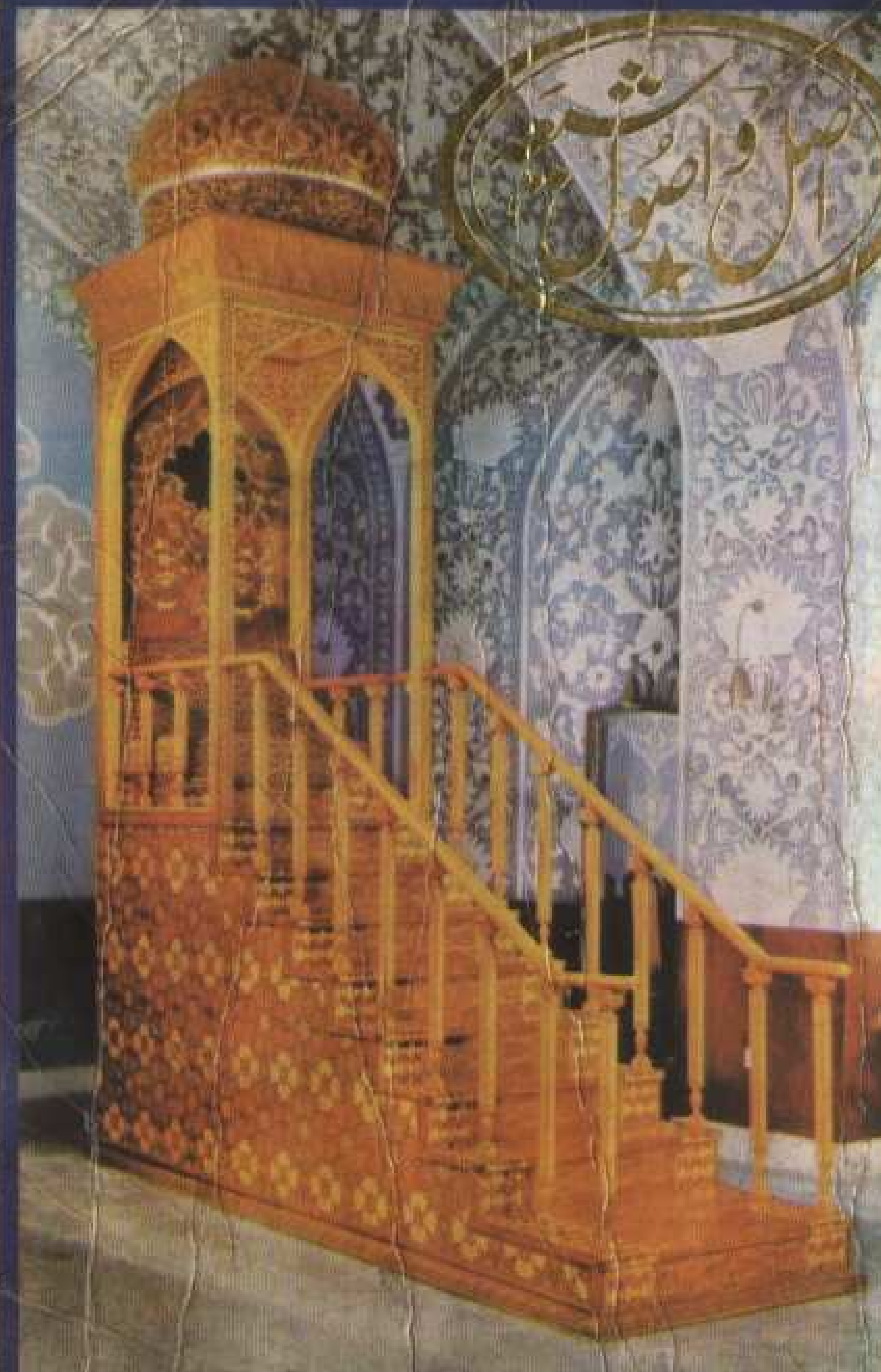

اصل و اصول شیعہ


اصل و اصول شیعہ

☆ رشحاتِ قلم ☆

آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء

اصل و اصولِ شیعہ

☆ ترجمہ، تقدیم اور حاشیئے ☆

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید ابن حسن نجفی

ادارۂ تمدنِ اسلام

پوسٹ بکس ۱۳۶۹۸ کراچی (۳۸) فون: ۴۳۳۴۶۷۰

بارہ خلفاء کے بارے میں حضور صلعم کے ارشادات
صفحہ نمبر ۱۲۳ پر بعنوان آئمۃ اثنا عشر
ملاحظہ فرمائیں۔
آیۃ خیر البریۃ کا ترجمہ صفحہ نمبر ۱۲۳
۲۷ حنر میں تکبیر کے نیچے دیکھیں

رشحاتِ قلم:
* آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء
ترجمہ، تقدیم اور حاشیے:
* حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید ابن حسن نجفی
پیش کش:
* سید شمس نجفی
خطاطی:
* رشید رستم قلم
صورت گری و اہتمام:
* سید انصار حسین واسطی
مطالعہ آیاتِ قرآنی:
* محمد اقبال نعیمی (ریسرچ آفیسر محکمہ اوقاف)
طباعت:
* المشہد پرنٹنگ ایجنسی بہ تعاون فضلی سنز
ناشر:
* ادارہ تمدنِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۶۹۸ کراچی ۳۸

اشاعت:
* ماہ صفر ۱۴۰۷ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۶ء

* ترتیب *

چند ضروری باتیں

بنیادی نظریات

نظامِ عمل

حدود اور تعزیرات

خاتمہ

عرضِ حال

آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء ۱۹۵۲ء میں مؤتمر عالم اسلامی کے اجتماعات میں شرکت کیلئے جب پاکستان آئے، تو کراچی میں قیام کے بعد لاہور کو بھی شرفِ قدوم بخشا، اور لاہور کی ایک علمی تقریب میں آپ نے حجۃ الاسلام علامہ نجفی سے فرمایا کہ:

"اَصلُ الشّیعۃِ وَ اُصُولُہا کو اگر آپ کا قلم اُردو میں منتقل کر دے تو بڑا کام ہو جائے"

نجفی صاحب نے حامی بھر لی۔ اور انتہائی نامساعد حالات کے باوجود کچھ ہی عرصے میں اس بیش بہا کتاب کو اُردو کا جامہ پہنا دیا۔

مگر جوں ہی رضا کار بکڈپو نے اس کی اشاعت کی تیاری کی، مترجم نے کراچی میں سکونت اختیار کر لی: نتیجۃً نہ تو آپ دوبارہ مسوّدہ دیکھ سکے، نہ پروف پڑھنے کا موقع دستیاب ہوا اور کتاب چھپ گئی۔ اب اس میں جو کسر رہ گئی تھی، اس کی وجہ سے غلطیوں اور خامیوں کا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔

لیکن اِس کے باوجود کتاب اِتنی مقبول ہُوئی کہ پاک وہند میں بار بار شائع کی گئی اور دونوں ملکوں میں بیسیوں ایڈیشن نظر آنے لگے! البتہ اِس عنوان سے اغلاط بڑھتے گئے، اور کئی زاویوں سے یہ پیش کش بڑی بدقوارہ ہوکر رہ گئی۔

یہ دیکھتے ہوئے ادارۂ تمدّنِ اسلام نے فیصلہ کیا کہ اَب کتاب پر نظرِ ثانی کرواہی لی جائے اور پھر شایانِ شان طریقہ پر طباعت کا مرحلہ طے پائے۔

بہرحال! ادارے کے کارپردازوں نے حضرتِ علامہ نجفی کی خدمت میں یہ گزارش پیش کی۔ آپ نے ہماری استدعا قبول فرماکر نہ صرف کتاب کی تصحیح کردی بلکہ ہر طرح سے اس کی نوک پلک ٹھیک کرکے جگہ جگہ حاشیے بھی لکھے اور ایک نہایت عالمانہ مقدمہ بھی شامل فرمادیا۔

اب یہ اشاعت نئی سج دھج اور بہت سے اضافوں کے ساتھ قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش ہے ؎

گر قبول افتد خوشا قسمت زہے عزّ و شرف!

ادارۂ تمدّنِ اسلام

آیۃ اللہ کاشف الغطاء

★ —— از: سیّد شمس نجفی

حلّہ، دریائے فرات کے کنارے عراق کا وہ "شہرِ خوباں" ہے جس کا پُرانا رشتہ تو بابل .Babylon کی گلیوں سے ملتا تھا، مگر طلوعِ اسلام کے بعد اس کی بہاروں میں کچھ ایسا نِکھار آیا کہ اِس بستی کی "ہر راہ و منزل" نے مذہبِ حق کے ایوانِ تمدّن کو "شمع و گُل" کا اِتنا بڑا، اور لازوال ذخیرہ پیش کیا، جسے دیکھ کر دینِ خُدا کی تاریخ جھوم اُٹھی۔

حلّے کے جنوب میں بحناجہ نامی ایک آبادی ہے۔ قدیم زمانے سے اس میں شیخ خضر ابن محمّد ابن یحییٰ ابن مطر ابن سیف الدین مالکی[1] کا کنبہ آباد تھا۔ لیکن بارھویں صدی ہجری میں شیخ خضر اپنے گھرانے سمیت نجفِ اشرف چلے آئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے!

مولائے متّقیان امیر المومنین علیہ السّلام کے قبّۂ مُبارکہ کی گھنی چھاؤں اور علم و دانش سے چھلکتے ہوئے اس معمُورے میں پروردگارِ عالم نے شیخ خضر کو شیخ جعفرِ کبیر جیسا فرزندِ ارجمند عطا فرمایا۔

یہ وہی عظیم دانشور ہیں، جنھیں ان کے فقہی شاہ کار "کشف الغطاء" کی نسبت سے کاشف الغطاء کہا گیا۔ اور پھر یہ نام ان کے گرامی مرتبت قبیلے کی پہچان بن گیا!

شیخ جعفر کاشف الغطاء اعلی اللہ مقامہٗ عرفان و آگہی کا چلتا پھرتا مجسّمہ اور اخلاقِ الٰہی کی ایک متحرک درسگاہ تھے،

[1] اس گھرانے کا تعلق امیر المومنین علیہ السّلام کے شاگردِ رشید "مالک الاشتر" ابن الحارث النخعی سے تھا۔ اس لئے پُورا خاندان اپنے آپ کو مالکی کہلوانے میں فخر محسُوس کرتا تھا۔

صاحبِ "مُستدرک الوسائل" میرزا حسین نوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" یوں تو ہمارے تمام علماء اپنے دَور میں علم و تقویٰ کی علامت اور آپ اپنی نظیر تھے۔ مگر حرفِ حق یہ کہ، بزرگ عالی قدر شیخ جعفر ابن شیخ خضر جناجی نجفی کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ممدُوح نے اپنی گراں بہا تصنیف کشف الغطاء کے ذریعے قوانینِ شریعت اور فقہی مشکلوں کو حیرت انگیز حد تک آسان بنا دیا۔ یہ کتاب پڑھئے تو یُوں لگتا ہے جیسے کوئی سُبک رفتار کشتی نہایت بے تکلّفی سے آب و حباب کو چیرتی ہوئی ساحلِ مراد سے لگ گئی!"

"فقہ و اصول" میں مکاسبؔ و رسائل جیسا تخلیقی کارنامہ انجام دینے والے فخرِ روزگار، خاتم الفقہاء والمجتہدین شیخ مرتضیٰ انصاری (متوفی سنہ ۱۲۸۱ھ) نے اس بیش بہا تصنیف کے بارے میں فرمایا تھا، کہ:

" شیخ جعفر کبیر نے کشف الغطاء میں جن اصُول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے، اگر کوئی شخص واقعاً انھیں ٹھیک سے سمجھ لے تو میں اسے مجتہد مان لوں گا"

یہ تو ہوئی کتاب کی بات — اب رہی خود صاحبِ کتاب کی شخصیت — تو اِس بارے میں شیخ عبدالحُسین تہرانی جو آیۃ اللہ نوری کے استاد تھے، ارشاد فرماتے ہیں:

"شیخ جعفر کے ذوقِ عبادت، گِریۂ شب، دُعائے سحرگاہی اور شریعت کے احکام بجالانے کے شوق و انہماک کو دیکھ کر یقین آنے لگتا تھا کہ جنابِ امیر علیہ السّلام نے اپنی دِل آویز گفت گو سے احنف ابنِ قیس کے دِل و دماغ کو جس نمُونے کے "صحیح سلوتر آدمی" کا پیکر عنایت کیا تھا، اس انداز کے بس! یہی ایک مردِ کامل ہیں!"

شیخ جعفر! استادِ کُل اور عِلمی دُنیا کی تاریخ ساز شخصیت محمد باقر وحید بہبہانی (متوفیٰ ۱۲۰۵ھ) کے شاگردِ رشید تھے۔ اور سیّد مہدی بحرالعلوم (متوفیٰ ۱۲۱۲ھ) جیسے دیدہ ور حق شناس نے ان کی رُوحانی تربیت میں بھرپور حصّہ لیا تھا۔

خود ان کے تلامذۂ کرام کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ جس میں بیس ہزار صفحات اور تقریباً پچاس جلدوں پر مشتمل اسلامی قوانین کے "دائرۃ المعارف" "جواہر الکلام" کے مُدوّن شیخ محمد حسن نجفی کا اسمِ گرامی

نمایاں نظر آتا ہے، اور ان حقائق کے پیشِ نگاہ کسی جھجک کے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شیخ جعفر کبیر کے عِلمی آثار صدیوں پر پھیلے ہُوئے ہیں۔

"اصل و اصُولِ شیعہ" کے مصنّف اُسی دُودمانِ لوح و قلم" اور "خاندانِ نور و حکمت کے چشم و چراغ ہیں جس کے مورثِ اعلیٰ شیخ جعفر کبیر صاحبِ کشف الغطاء تھے!

آیۃ اللہ شیخ محمد حُسین آلِ کاشف الغطاء ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۶ء "مدینۃ العلم" نجفِ اشرف میں پیدا ہوئے۔ بنیادی تعلیم مکمّل کرنے کے بعد آپ نے "کفایۃ الاصول" جیسی گراں بہا کتاب لکھنے والے برجستہ عالم شیخ محمد کاظم خراسانی متوفیٰ ۱۳۲۹ھ سے "اصُولِ فقہ" پر عبور حاصل کیا، "فقہی قواعد" میں بصیرت حاصل کرنے کی غرض سے پہلے تو ملّا رضا ہمدانی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، بعدازاں اس دَور کے سب سے بڑے قانون داں اور عملی قوانین کے مثالی مجمُوعے "عروۃ الوثقیٰ" کے آفریدگار سیّد محمد کاظم طباطبائی (متوفیٰ ۱۳۳۷ھ) کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے

"علمِ حدیث" میں تبحر حاصل کرنے کے لئے آپ نے مایۂ ناز تالیف مستدرک الوسائل کے جامع حاج میرزا حسین نوری (متوفی ۱۳۲۰ھ) کی خدمت میں حاضری دی۔ نیز فلسفے، کلام اور حکمت وہیئت پر گرفت مضبوط کرنے کے خیال سے شیخ احمد شیرازی، میرزا محمد باقر اصطہباناتی اور شیخ محمد رضا نجف آبادی جیسے پایہ کے دانش مند اساتذہ سے بہرہ مند ہوتے۔

سید محمد کاظم یزدی طباطبائی اعلی اللہ مقامہ کی رحلت کے بعد آیۃ اللہ کاشف الغطاء کو جو بلند مقام ملا، نیز بین الاقوامی پیمانے پر جتنی شہرت حاصل ہوئی وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

ممدوح اپنی غیر معمولی ذہانت، مسلمہ زعامت، زبان زدِ عام شجاعت، سیاسی بصیرت اور اجتماعی شان وشوکت کیلئے بھی ضرب المثل تھے۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں بھی آپ اپنا جواب تھے۔ عربی زبان وادب پر کاشف الغطاء کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی اس خوبی سے متاثر ہو کر شیخ العروبہ احمد زکی پاشا اور امیر البیان شکیب ارسلان نے بھی عقیدت کے پھول برسائے ہیں۔ نیز آپ کے خطبات و مقالات اور

پھر آپ کی لکھی ہوئی کوئی اٹھائیس بیش قیمت کتابیں اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کے سامنے کچھ مقاصد تھے۔ اور ان میں سب سے بڑا ہدف دنیائے اسلام کی فکری آزادی، ذہنی بیداری، سیاسی استقلال، جغرافیائی استحکام ہمہ جہتی ترقی، اور ملتِ مسلمہ کا سچا، قدرتی اتحاد تھا۔

بس! اسی غرض کے حصول کے لئے آپ نے ہمیشہ "صریرِ خامہ اور نوائے سروش" کے ساتھ اپنے آپ کو حرکت میں رکھا۔ "اصل واصول شیعہ" اسی جذبے کی عکاس! — نیز مغربی سامراج کے خلاف کوت اور نجف کے محاذوں پر "تفنگ بردوش ہو کر گرم جنگ" میں عملی شرکت اس عظیم مجاہد کے شعورِ حریت کی بہترین ترجمان ہے!

جس زمانے میں استعماری کارندوں نے دینی حلقوں کو یہ باور کروا دیا تھا کہ علمائے کرام کے لئے سیاست "شجرۂ ممنوعہ" اور سیاسی حالات کو مرکزِ توجہ بنانا بہت بری بات ہے! اس زمانے میں آیۃ اللہ کاشف الغطاء فرماتے تھے کہ:

"میں سر سے پاؤں تک سیاست میں ڈوبا ہوا ہوں"

سیاست میں حصّہ لینا میرا فرضِ منصبی ہے، یہ میری ذمّے داری ہے! اور میں اِس سلسلے میں اپنے ضمیر اور اپنے خالقِ یکتا کے سامنے جوابدِہ ہوں"

آپ اکثر امامِ معصومؑ کے اِس ارشادِ گرامی کو دُہرایا کرتے تھے کہ:

"خُداوندِ عالم نے علماء سے اِس بات کا وعدہ لیا ہے کہ: وہ عاجز، کمزور، بے نوا اور فاقہ کش عوام کا حالِ زار دیکھ کر نہ کسی سے سمجھوتہ کرینگے اور نا ہی مصلحتوں کا سہارا لے کر خاموشی روا رکھیں گے!"

مرحوم نے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت اور اپنے عزائم کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے متعدد ملکوں کا دورہ کیا.

سنہ ۱۳۲۸ھ میں آپ فریضۂ حج بجالانے کے واسطے حجازِ مقدس گئے. وہاں سے شام کے لئے رختِ سفر باندھا. بعدازاں لبنان کی جانب عزیمت فرمائی. یہاں پہنچ کر کچھ عرصے صیدا میں ٹھیرے، اور پھر تقریباً دو مہینے تک بیروت سمیت لبنان کے "صنوبر زار" میں مختلف شہروں کو فیض پہنچاتے رہے. اس کے بعد آپ

مصر تشریف لے گئے، اور کوئی تین ماہ وہاں قیام فرمایا۔

قاہرہ میں جامع ازہر کے دانشوروں اور دوسری باسواد اور بااثر شخصیتوں سے آپ نے صرف تبادلۂ فکر و نظر ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ان کی سوچ کو ایک رُخ دیا اور ان کے ذہن کو ایک جہت عطا فرمائی۔

"وادیِ نیل" کے ثقافت خیز ماحول میں اس نابغۂ عصر نے جو نمایندہ خطبے دیئے، جو بے نظیر تقریریں کیں، اربابِ دانش و بینش انھیں علم و ادب کا بہت قیمتی سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

سنہ ۱۳۵۰ھ میں آپ نے فلسطین میں منعقد ہونے والے "مؤتمرِ اسلامی" کے اجتماعات میں شرکت کی اور پھر القدس کے بعد حیفا. نابلس اور یافا بھی تشریف لے گئے.

پس ازآں دو سال گزرے ہوں گے کہ آپ پہلی بار ایران کے سفر پر نکلے. یہاں آستانِ قدسِ رضویؑ کی زیارت سے مشرف ہو کر مدتوں شیراز. کازرون. بوشہر. آبادان. ہمدان اور تہران میں وہاں کے "کم و کیفِ حیات" کا جائزہ لیتے رہے.

دوسری مرتبہ ۱۳۶۶ھ میں آپ نے ایران کا ارادہ کیا۔ اور کچھ وقت شہر کرند میں گذارا۔ نیز تیسری دفعہ ۱۳۶۹ھ میں پھر عازم ایران ہوئے۔ اب کی زندگی کی زیادہ سانسیں مشہدِ مقدس میں لیں۔ ساتھ ساتھ یہاں کے نامی گرامی علماء و فقہاء سے مذاکرات کیے اور بہت سے اہم مسائل پر بحث و گفتگو کی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔

۱۳۷۰ھ میں ایک بار پھر جناب نے شام و لبنان وغیرہ کا قصد فرمایا۔ مگر یہ سفر تبدیلیِ آب و ہوا کی وجہ سے کرنا پڑا کیونکہ علالت جڑ پکڑ چکی تھی، اور معالج چاہتے تھے کہ غیر معمولی مشاغل سے دور رہ کر، آپ کسی صحت افزا مقام پر آرام فرمائیں! لیکن کاشف الغطاء جیسی "ہمہ دل سوز و ہمہ جاں تپش" ہستیوں کے لئے یہ کہاں ممکن ہوتا ہے؟ چنانچہ جلد ہی وطن لوٹ آئے، اور معمول کے مطابق اپنے کاموں میں لگ گئے۔

۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں حکومتِ پاکستان کی خصوصی دعوت پر آپ نے "موتمر عالمِ اسلامی" کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے نجف سے کراچی تک کی طویل مسافت طے فرمائی

پھر یہی نہیں بلکہ اپنی بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود لاہور، پشاور اور راولپنڈی کے "شب و روز" دیکھتے ہوئے آزاد کشمیر کے مرکزی شہر مظفر آباد بھی گئے۔

ان تمام مقامات پر، آپ نے جو تقریریں کیں، انہیں مسلمانوں کے "سیاسی ادب" میں نہایت ممتاز جگہ حاصل ہے۔

آیۃ اللہ کاشف الغطاء کی پوری زندگی اور زندگی کی ہر گھڑی "زبان و بیان اور کلک و قرطاس" کے ذریعے جہاد کرتے ہوئے گذری۔ اب بھلا ایسے لوگ زیادہ دِن کہاں جیتے ہیں؟ چنانچہ جب طبیعت زیادہ بگڑی تو پہلے بغداد جاکر علاج کروایا۔ شروع شروع میں قدرے افاقہ ہوا، اِس لئے گھر آگئے ____ مگر تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ بیماری نے دوبارہ زور باندھا، اور بالآخر بغداد کے الکرخ ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ اب کے یہاں بھی مداوا نہ ہو سکا، تو ایران کے شہر کرند کی درمان گاہ لیجایا گیا لیکن ...... رہے نام اللہ کا!

۱۸ ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۵۴ء، دوشنبہ کا دن تھا کہ فرزندانِ توحید میں "عقابی رُوح" جگانے والے بیدار مغز قائد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مگر طے شدہ حقیقت یہ ہے کہ جن ہستیوں کی "انگلیاں فگار اور خامہ خوں چکاں" رہا ہو، وہ مرتے نہیں اَمر ہوتے ہیں! ان کی زندگی کا ہر نقش پکار پکار کر کہتا رہتا ہے ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مضمون کے مآخذ:

۱۔ ریحانۃ الادب ―――― حجۃ الاسلام میرزا محمد علی مدرس
۲۔ مالک الاشتر ―――― حجۃ الاسلام شیخ عبد الواحد مظفر
۳۔ فقہای نامدار شیعہ ―――― حجۃ الاسلام عبد الرحیم عقیقی
۴۔ ملامح من حیاۃ کاشف الغطاء ―――― استاد محمد شریف آل کاشف الغطاء
۵۔ محاضرات ―――― حجۃ الاسلام سید ابن حسن نجفی

٭حرف٭ وحکایت٭

★ ―――― حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید ابن حسن نجفی

اسلام نے اپنے "ابدی منشور" میں جس زور و شور سے تمام انسانوں کی "تعظیم و تکریم" کے خیال کو دُنیا سے روشناس کروایا ہے، اسی شدّ و مد کے ساتھ وحدتِ اسلامی کا نظریّہ بھی پیش کیا ہے۔ مگر، افسوس! کہ طرح طرح کی اُفتادوں سے ہر زمانے میں "فرزندانِ قرآن" کا شیرازہ بِکھرتا ہی رہا! البتّہ یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ مختلف ادوار میں پگھلا ہوا دِل رکھنے والے کئی دانشوروں نے خدائے یکتا کے ماننے والوں کو تسبیح کے دانوں کی

طرح ایک رشتے میں پرونے کی مخلصانہ جدوجہد کی ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرآمد فقہائے روزگار شیخ مرتضیٰ الانصاری رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۸۱ھ) کے نامور شاگرد اور عظیم رہنما سید جمال الدین افغانی اسد آبادی (متوفی ۱۸۹۷ء) نے تتر بتر مسلمانوں کی بکھری ہوئی صفیں سیدھی کرکے انھیں توحید کے جذبے سے سرشار کرنا چاہا، اور بڑے صبر آزما، طاقت ربا، زہرہ گداز حالات کے باوجود خاصی نمایاں کامیابی حاصل کی۔

یقینی بات ہے کہ شبستانِ بہارِ رحمت سے آج بھی ان کی رُوح وجد میں آکر کہہ رہی ہوگی ؎

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

پھر بیسویں صدی کے شروع میں آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے اُس "تحریک" کی قیادت سنبھالی، جسے جمال الدین افغانی نے اپنے کلیجے کا لہو دے کر زندہ کیا تھا، اور حقیقت یہ کہ کاشف الغطاء نے اس بصیرت افروز جنبش کو دُور دُور تک پہنچانے اور انتہائی دل آویز بنانے کے لئے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں صرف کر دیں ؎

عمرہا باید کہ تا یک مردِ صاحبدل شود!

"اصل و اصول شیعہ" آپ کے ان ہی مساعی جمیلہ کا ایک بیش بہا شاہکار ہے۔

یہ پیش کش محض چند صفحوں پر مشتمل روایتی انداز کی کوئی کتاب نہیں، بلکہ کلمہ پڑھنے والوں کے لئے ایک فکر انگیز پیغام، ایک ذہن ساز تحریر، اور اُمتِ مُسلمہ میں اتحاد و اُخوت کے جذبے جگانے والی ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔

مانی ہوئی بات ہے، جب تک مسلمانوں میں ایکا نہیں ہوگا اس وقت تک نہ تو ان میں صحنِ عالم کو توحید کے نظریے سے سجانے کی سکت پیدا ہوگی اور نہ وہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ؛

" دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں
کی ہدایت کے لئے لایا گیا ہے!"

سورہ آلِ عمران - آیت : ۱۱۰

کے معیار پر پورے اُتریں گے!

قرآنِ حکیم نے دینِ حق سے وابستگی رکھنے والوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ آپس میں گھُل مِل کر رہنے کی عادت اور متفقہ حکمت عملی اختیار کرنے کی خو ڈالیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلام سے

پہلے کے دور کی جانب توجہ دلاتے ہوئے اس نعمتِ عظمیٰ کی یاد دہانی کروائی ہے جو ٹوٹے ہوئے رشتوں کے جڑنے اور انمل دلوں کے ملنے سے حاصل ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ٥

"سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور تفرقے میں نہ پڑو! نیز پروردگارِ عالم نے تم پر جو احسان فرمایا ہے، اسے یاد کرتے رہو۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمھارے دل ملا دیئے، اور اس کی مہربانی سے تم سب بھائی بھائی بن گئے۔ تم دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اللہ اسی طرح تمھارے

لئے اپنی نشانیاں روشن کرتا ہے، تاکہ تمھیں سیدھی راہ نظر آجائے:

(سورۂ آلِ عمران۔ آیت: ۱۰۳)

اب اس کے باوجود جو لوگ خود کو مسلمان کہلوانا ضروری سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کے نظامِ اجتماعی کے لئے جو فلسفہ متعارف کروایا گیا ہے، اسے خاطر میں لانے کے لئے تیار نہیں ہیں، کتابِ الٰہی ان سے یوں خطاب کرتی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ٥

"کہیں! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو تفرقے کا شکار ہو گئے، اور واضح ہدایات کے ہوتے ہوئے بھی، اختلافات میں پھنس کر رہ گئے۔ جنھوں نے یہ رویّہ اختیار کیا وہ بڑی سخت سزا پائیں گے۔

سورۂ آلِ عمران۔ آیت: ۱۰۵

جس دستورِ حیات میں تفریق و تقسیم سے بچنے پر اِتنا زور دیا گیا ہو۔ اور اِتحاد و اُخوت کے بارے میں اس درجہ شرح و تفصیل پائی جائے، اس کے وفاداروں میں تو اِنتشار، پراگندگی اور افراتفری کا نام و نشان تک نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر، صاحب! جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ بات بات پر قرآن اُٹھانے والوں میں اختلاف، آویزش اور تصادم کے سوا، اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔!

خاص طور پر مختلف مکاتبِ فکر اور مسالکِ فقہ کے حوالے سے تو یہ قوم ہمہ جاں زخم و ہمہ تن جراحت بنی ہُوئی ہے۔ ـــــ اور اِس وجہ سے سب سے بڑا نقصان یہ ہُوا کہ اسلام جو ایک رواں دواں، آفاق گیر، انقلابی نظامِ فکر و عمل تھا، اس کی باڑھ رُک گئی، وہ دَلدل میں پھنس کر رہ گیا، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ سیاسی اور معاشی قزاقوں نے اسے ایسا لوٹا کہ حُلیہ تک بگاڑ ڈالا۔

مقابلے اور بناوٹ، کاٹ، چھانٹ اور آپس کی ضدم ضدّا سے جو عنوان اُبھرے ہیں، ان میں شیعہ سُنّی مسئلہ سرِ فہرست رہا، اور ہے ـــــ تاریخ سے پوچھئے! اِس نام پر دَھرتی نے

کتنا خُون پیا ہے۔ فضا میں کتنی آہیں بکھری ہیں اور اُوپر سے کیا کیا آفتیں نازل ہوئی ہیں؟ نیز آج بھی، اس روشن دَور میں، ہاں! ہاں! "تسخیرِ ماہ و انجم" کے عہد میں جو صورت واقع ہے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے؛ کلمہ گو لو! ؎

کیا زمانے میں پَنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

دُنیا کے بیشتر حصّوں میں اہلِ سنّت کی تعداد زیادہ ہے اب یہ قدرتی بات ہے کہ اکثریت میں ہونے کے باعث ان کی ذمّہ داریاں بھی قدرے بڑھ جاتی ہیں۔ سیاسی رُخ سے دیکھیے یا اخلاقی جہت سے، کم تعداد رکھنے والی جماعتوں کے تمام "مدنی حقوق و مراعات" کے تحفظ اور نگہداشت کا فرض "سوادِ اعظم" MAJORITY ہی پر عائد ہوتا ہے۔

لیکن! دیکھا یہ گیا ہے کہ اور تو اور ان کے باسواد، سمجھ دار اور فعّال طبقے نے بھی اس اہم ذمّے داری کا بہت کم لحاظ رکھا ہے، اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر دَور میں ذہنی تعارف کا فقدان رہا ہے۔ نیز یہی وہ مشکل ہے جو ہمیشہ مفاہمت میں آڑے آتی ہے اور حشر برپا ہوتا ہے۔

دَلیل کے طور پر عرض کیا جاسکتا ہے کہ عددی برتری رکھنے

والوں کے تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور بااثر اشخاص نے کبھی بھی شیعہ دانشوروں سے ان کے "عقائد و مسلمات" پر تبادلہ خیال کر کے یا شیعی لٹریچر کے ذریعے "مدرسہ تشیع" کو ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی! نتیجۃً جب مفاد پرست عناصر اپنے اغراض و مقاصد کے لئے زبان و قلم کے سہارے افواہوں اور ہوائیوں کا بازار گرم کر دیتے ہیں، تو یہ ترکیب عوام الناس کو منفی کردار انجام دینے کے ساتھ ساتھ، متین اور موثر ہستیوں کو خاموش رکھنے کے لئے جادو کا کام دیتی ہے! مگر اس تغافل یا تساہل کے سبب "اتحادِ ملی" کا دامن تار تار ہوتا رہتا ہے، معاشرتی زندگی کے بل نہیں نکل پاتے، اور "توحید کا نظریہ" فریادی ماتم کرنے لگتا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ ہرچہ کرد بامن آشنا کرد

اس خصوص میں شیعوں کے ترجمان اور اسلام کا درد رکھنے والے افراد نے جب کبھی بھی اکثریتی فرقے کے دانش مند حضرات کو اس نکتے کی جانب توجہ دلائی، تو سدا یہ جواب ملا کہ ـــ "ہمیں تو شیعوں کا دینی ادب ہی دستیاب نہیں ہوتا۔" ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

الحاصل! آیۃ اللہ کاشف الغطاء طاب ثراہ تک بھی یہ باتیں پہنچی تھیں۔ لیکن! آپ نے دستِ تاسف مل کر سکوت اختیار کرنے کے بجائے، عذر و معذرت اور تاویل و توجیہ کے تمام راستے ممکن حد تک بند کر کے نہ صرف اپنی بلکہ تمام شیعہ اکابر کی مقدس تحریک "وحدتِ اسلامی" کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے اصل و اصول شیعہ قلم بند فرما دی، اور بہت جلدی ان کی اس عالمانہ اور مخلصانہ کوشش کو قبولِ عام حاصل ہو گیا بقولِ غالب ؎

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے!

"اصل و اصولِ شیعہ" کا جب پہلا اردو ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا تو اُس وقت کے صوبائی گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی نے "رضا کار بک ڈپو" کے سربراہ جناب شیخ محمد صدیق صاحب کو ایک خط ارسال کیا، جس میں تحریر تھا:

"شیعوں کے مذہبی خیالات کے بارے میں، خاصے شکوک و شبہات نے مجھے گھیر رکھا تھا مگر آپ کی طبع کردہ کتاب "اصل و اصولِ شیعہ" پڑھ کر بہت سی باتیں صاف ہو گئیں۔ میں سمجھتا

ہوں کہ میری طرح میرے بعض احباب بھی اِس صُورتِ حال سے دوچار ہوں گے۔ اچھا ہے کہ وہ بھی اِس کتاب کا مطالعہ کرلیں، تاکہ اگر کوئی بدگمانی ہے تو دُور ہوجائے۔ بنابریں کچھ اور نسخے بھیج دیجئے، تاکہ دوستوں کو پہنچادوں۔"

(یہاں صرف اقتباس دیاگیاہے۔ اصل خط صدیق صاحب کی فائیل میں محفوظ ہے)

آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء اعلی اللہ مقامہٗ کی یہ تصنیف اختصار کے باوجود اتنی جامع و مانع ہے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ، "دریا کو کوزے میں بند کرنے" کا محاورہ شاید اسی پیش کش کیلئے ایجاد ہُوا تھا۔ سچ تو یہ کہ اِس دفترِ کمال میں ایک جملے کی بھی کمی بیشی ممکن نہیں! مقدمے میں بہت کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیا کروں؟ آج کل میں عمان میں ہوں۔ اور یہاں کی مصروفیت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ پھر بار بار سفر کرنا پڑتا ہے۔ اِس وقت بھی قلم ہاتھ میں لئے پابہ رکاب ہوں۔ ! کراچی، کراچی سے لندن، مینچسٹر، برمنگھم اور ممکن ہے، وہاں سے کیلیفورنیا وغیرہ وغیرہ —— لہٰذا دیباچے کے واسطے دامانِ خیال میں جو چُن کر رکھا تھا، زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ اسے ترتیب

دے کر ایک مستقل کتاب کی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

ہِردست اِس معروضے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ بیش قیمت مجموعہ جہاں دُوسروں کے لئے شیعی نظریات کے تعارف و تفہیم کا بڑا سنبھلا ہوا اور نہایت مستند وثیقہ Documnt ہے، وہیں خود شیعوں کے لئے بھی باقاعدہ، مسلسل، منظم اور مربوط مذہبی دانش و بینش کا ایک خزانۂ عامرہ ہے۔

دُنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوچکے ہیں، اور اہلِ علم وفضل اس حد تک اس سے مانوس ہیں کہ مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب اب حوالے کی کتاب بن چکی ہے۔

آدھی صدی کی طویل مدت میں، مصر، شام، لبنان، عراق ایران۔ تونس اور الجزائر وغیرہ میں، "تاریخِ مذاہب۔ فلسفۂ ادیان اسلامی عقائد و اعمال نیز مختلف مکاتبِ فکر و نظر کے تقابلی مطالعے کے عنوان سے جتنی بھی تحریریں سامنے آئی ہیں، بلامُبالغہ ان میں سے پچانوے ۹۵ فیصد مطبوعات میں" اصل و اصول شیعہ" کا نام ضرور دیکھا گیا ہے۔

ادارۂ تمدنِ اسلام کے کارپرداز اسے نئی آب و تاب کے

ساتھ پھر سے چھاپ رہے ہیں۔ اُمید کہ اس جدید اشاعت کے سلسلے میں ان کے مساعی بار آور ہوں گے ۔۔ دستِ شوق اس ارمغان ہمیشہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور قدر کی نگاہیں اسے ہر لحظہ دِل میں جگہ دیں گی۔

۱۵ ذوالحجہ سنہ ۱۴۰۶ھ
مطابق ۲۱ اگست سنہ ۱۹۸۶ء

نجفی

وجہِ تالیف

دو برس پہلے کی بات ہے، دیارِ مصر سے ایک عراقی طالبِ علم کا خط آیا۔ مکتوب خاصا طویل اور اس کا مَاحصل یہ تھا:

"نامہ نگار نے "جامعہ ازہر" کے بڑے بڑے علماء سے تبادلہ خیال کیا، نجفِ اشرف اور اس دانشگاہ کے علماء، پڑھنے پڑھانے کے طریقوں نیز مشہد علوی کی روشن فضا سے لَو لگانے والوں کا بھی ذکر آگیا۔ اس میں شک نہیں کہ قاہرہ کے علمی حلقے

"جامعۂ عظمیٰ نجف" کی جی بھر کر تعریف کرتے ہیں اور یہاں کے افاضل کی ذہنی ترقیوں سے بھی کافی متاثر ہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہر تیسرے یہ ضرور کہتے ہیں — "ہائے افسوس! کہ وہ شیعہ ہیں!"

خط لکھنے والے کا بیان ہے کہ مجھے اس پر بڑا تعجب ہوتا تھا اور اکثر ان حضرات کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ صاحبو! شیعہ بھی ایک اسلامی فرقہ اور مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ملتا: کہ "نہیں جناب! شیعہ مسلمان نہیں، "تشیّع" کو اسلام سے کیا تعلق؟ بلکہ اسے تو مذاہب و ادیان میں شمار کرنا ہی غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو ایرانیوں کی ایک اُپج اور اموی حکومت کو عباسی شہنشاہیت میں بدلنے کا ایک سیاسی ڈھونگ تھا، اسے خدا کے بنائے ہوئے راستوں سے کیا واسطہ!

بعد ازاں یہ نوجوان تحریر کرتا ہے:

"جنابِ والا! میں ابھی کم سن ہوں اور "مذہبیات" سے بے خبر، نہ مجھے ادیان کے بڑھنے چڑھنے کا فلسفہ معلوم ہے اور نہ ان کے پھلنے پھولنے کی تاریخ سے واقف ہوں۔ بنابریں کچھ شکوک پیدا ہو چلے ہیں، اور کیوں نہ ہوں، اس لئے کہ جن بزرگوں سے

مجھے گفتگو کا موقع ملا، وہ بڑے پایہ کے عالم ہیں"

یہ جملے لکھ کر مصر کی اعلیٰ درس گاہ (ڈگری کالج) کے اس طالبِ علم نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اُٹھا کر اسے ذہنی کشمکش سے چھٹکارا دلاؤں۔ اس سلسلہ میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اگر التجا رائیگاں گئی، اور میں راہ سے بے راہ ہو گیا تو جناب ذمہ دار ہوں گے!"

چنانچہ میں نے جواب ضروری سمجھا، اور ایک خط میں جتنا مطلب آ سکتا تھا، اور اس کی فہم کے مطابق جو مضمون سما سکتا تھا وہ لکھ کر بھیج دیا۔ لیکن واقعہ یہ کہ اس نوجوان کو جتنے شبہات تھے اس سے زیادہ مجھے حیرانیاں —!

سوچتا تھا کہ یہ بات کیسے صحیح مان لی جائے۔ مصر جیسا متمدن ملک، اسلامی علوم کا گہوارہ، عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کا مرکزِ نظر اور وہاں کے دانشمندوں کے جہل و عناد کا یہ عالم؟ کسی طرح یقین نہیں آتا تھا، مگر اتفاقاً انہی دنوں مشہور قلم کار احمد امین کی وہ کتاب ہاتھ آ گئی جس کا نام ہے "فجر الاسلام" میں اس کا مطالعہ کرتا رہا، لیکن جب شیعوں کے حالات تک پہنچا تو رنگِ نگارش دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ فاضل مؤلف کتاب

کیا لکھ رہے ہیں، ہَوا میں محل کھڑے کر رہے ہیں۔ عہدِ حاضر میں اگر چین[1] کے دُور و دَراز علاقوں کا بھی کوئی آدمی ایسی غیر ذمہ دَارانہ تحریر پیش کرتا تو اُسے بھی آسانی سے مُعاف نہیں کیا جاتا۔ خیر اِس سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ عراقی طالبِ علم نے جو کچھ لکھا تھا، وہ بالکل درست تھا، اور معًا یہ خیال دَامن گیر ہُوا کہ جب احمد امین جیسے شوقِ تصنیف رکھنے وَالوں کے "ذہن و فِکر" کا یہ نقشہ ہے تو ناخواندہ یا نیم خواندہ عوام کی کیا کیفیت ہوگی؟ حالانکہ وقت کو

---

[1] ستمبر ۱۹۸۰ء میں مجھے چین جانے کا موقع مِلا۔ پیکنگ، شنگھائی، کینٹن اور سنکیانگ وغیرہ، جہاں کہیں بھی پہونچا، وہاں بڑے سُلجھے ہوئے لوگ ملے۔ میں نے شمالی امریکہ، یوروپ، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر علاقے دیکھے ہیں، اور تقریباً پُوری دُنیا کے مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے مگر چین جیسے پیارے مسلمان بہت کم نظر آئے۔

سنکیانگ کے صوبے میں طُرفان نام کا ایک تاریخی شہر ہے، جس میں اکثریت مُسلمانوں کی ہے۔ یہاں کے علمائے دین کو اگر مِثالی کہا جائے تو کچھ مُبالغہ نہ ہوگا۔

ختن اور کاشغر کی وَادیاں اِسی صُوبے میں ہیں جن کے سر سبز و شاداب دَامن میں شیعوں کی خاصی آبادی ہے۔

نجفی

دیکھتے ہُوئے آج کا ہر مُسلمان "وحدت و اُخوّت" کا حامی ہے۔ نیز اِس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ اگر اُمّتِ محمّدی کا شیرازہ بکھر گیا تو "نہ زندگی بھلی نہ موت"! سچ کہتا ہُوں اگر ہمارے مُسلمان بھائی مذھبِ شیعہ کی حقیقت سے آگاہ ہوتے، اور اِنصاف بھی کر سکتے تو ایسے لٹریچر کا وجُود ہی نہ رہتا۔ جس سے عداوتِ باہمی کی طرح پڑے۔ نیز اِستعماری طاقتوں اور بے دِین عناصر کی مُرادیں پُوری ہوں۔

اَب ذرا "فجر الاسلام" کی اِس عبارت پر غور کیجئے اور ردِّ عمل کا اندازہ فرمائیے:

صفحہ ۳۳۰ پر تحریر ہے:

"حق تو یہ ہے کہ تشیع اسلام کو برباد کرنیوالوں کی پناہ گاہ تھا!" الخ

لکھنے وَالا نادان نہیں، وہ جانتا ہے کہ ناقدوں کے قلم تعاقب کریں گے۔ اور یہ بھی معلوم کہ اس جارحانہ روش سے ایک ایسی قوم کے جذبات مجروح ہوں گے جو کروڑوں کی تعداد میں اور اِسلامی دُنیا کی بہت بڑی قوّت ہے۔

ہاں! یہ بھی عجیب اتّفاق ہے کہ گذشتہ سال (۱۳۴۹ھ) میں تیس ارکان پر مشتمل مِصر کا جو عِلمی اور ثقافتی وفد یہاں آیا

تھا، اس میں احمد امین صاحب بھی شامل تھے۔ وفد کے تمام ارکان میرے ہاں بھی تشریف لائے۔ رمضان کا مہینہ تھا، رات کا وقت اور بھری ہوئی محفل۔ احمد امین کو دیکھتے ہی "فجر الاسلام" یاد آگئی۔ کیونکہ یہ کتاب متعدد علماء کی نظر سے گزر چکی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں نے شکوہ کیا مگر، بمقتضائے شرافت بہت دبے لفظوں اور اتنے نرم لہجے میں کہ "کہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو" اس موقعہ پر احمد امین نے جو سب سے بڑا عذر پیش کیا وہ تھا "عدمِ واقفیت" اور کتابوں کی قلت"۔ اس پر ہم نے کہا۔ کہ جناب جب کسی موضوع پر قلم اُٹھتا ہے تو پہلے متعلقہ مواد فراہم کیا جاتا ہے، پھر پوری طرح اس کی چھان بین ہوتی ہے۔ ورنہ قلمکار کو وہ موضوع چھونے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

ملاحظہ فرمایئے! شیعوں کے کتب خانے کیسے بھرپور ہیں۔ خود ہمارے ہی مکتبہ کو دیکھ لیجئے تقریباً پانچ ہزار جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں بیشتر کتابیں اہلِ سنّت کی ہیں، پھر یہ علمی ذخیرہ نجف جیسے مختصر سے شہر میں اور مصر اپنی قابلِ لحاظ وسعتوں کے باوجود شیعی لٹریچر سے خالی ہے؟

ہاں! یہ لوگ شیعوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر لکھتے سب کچھ ہیں۔ اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ کہ عراق کے برادرانِ اہلِ سُنّت پڑوس میں رہتے ہوئے بھی شیعوں سے ناواقف ہیں!

چنانچہ چند ماہ قبل بغداد کے ایک ہونہار شیعہ سیّد زادے نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ حال ہی میں ضلع دلیم (یہ ضلع بغداد سے متصل ہے) جانے کا اتفاق ہوا اس علاقے کے اکثر باشندے سُنّی ہیں۔ راقم نے ان سے میل جول بڑھایا، ان کی محفلوں میں حصّہ لیا۔ چونکہ دلیم والے، مجھ "غریبِ شہر" کے ادب و تہذیب سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے اس لئے انھوں نے آنکھیں بچھادیں۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ جس شخص سے دلچسپی لے رہے ہیں وہ شیعہ ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہائیں! شیعہ! علم و تدیّن تو درکنار، ہم تو سمجھتے تھے کہ اس فرقے کے لوگ تمدن اور ثقافت کی معمولی روشنی سے بھی محروم ہوں گے، بالکل جنگلی، نرے وحشی! —— یہ تھے ہمارے بارے میں ان کے تصوّرات!

خط کے آخر میں، اس نوجوان نے میری حمیّت سے خطاب کیا ہے تاکہ میں اپنی قلمی مساعی سے غلط فہمیوں کا

ازالہ کرکے شیعیّت کا صحیح تعارف کراؤں۔

کچھ عرصہ بعد یہی نوجوان موسم گرما گذارنے کے لئے شام پہنچا۔ وہاں سے مصر چلا گیا۔ قاہرہ سے اس نے پھر ایک تحریر روانہ کی، جس کا خلاصہ یہ تھا:

"مصر کی حالت بھی دیلیم سے مختلف نہیں۔ یہاں بھی شیعوں کے متعلق وہی خیالات عام ہیں، لہٰذا التجا کی جاتی ہے کہ جناب اوّلین فرصت میں اپنا فرض ادا فرمائیں۔ یقین مانیئے! جمہورِ اسلام نے شیعوں کی بابت جو خیالات قائم کر رکھے ہیں، وہ بے حد کریہہ ہیں!"

پھر اسی پر کیا منحصر! مصر و شام وغیرہ کے جرائد میں آئے دن جو بہتان تراشیاں ہوتی رہتی ہیں کیا وہ کچھ کم اندوہناک ہیں؟ حالانکہ شیعوں کا صحیفہ عقائد "دامنِ یوسفؑ" کی طرح بے داغ ہے۔ مگر جہل و عصبیّت کا کیا علاج؟

الغرض ان بدعنوانیوں کے مقابلے میں خاموشی ظلمِ صریح کے مرادف تھی۔ لہٰذا مجھے ادائے فرض کی جانب متوجہ ہونا پڑا، مگر یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ نہ تو مجھے شیعوں کی طرف سے دفاع کرنا مقصود ہے اور نہ سوادِ اعظم کی

اِفترا پردازیوں کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ سب سے بڑا مدعا یہ ہے کہ عام اسلامی حلقوں سے جہالت کی تاریکی دور ہو اور سچائی کے راستے اچھی طرح دکھائی دینے لگیں، نیز عناد رکھنے والوں کے لئے حجت پوری ہوجائے اور ایوانِ تشیّع کے نقش و نگار واضح ہوجائیں۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا ازالہ ممکن ہوسکے، تاکہ احمد امین جیسے لکھنے والوں کو پھر کبھی تخریبی کارروائیوں کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

"فجر الاسلام" کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:—

"حق یہ کہ تشیّع ان لوگوں کی پناہ گاہ تھا جو کینہ اور عداوت کی وجہ سے اسلام کو برباد کرنے کے آرزومند تھے یا پھر ان لوگوں کے سر چھپانے کی جگہ بھی جو اپنی آبائی تعلیم یہودیت، نصرانیت اور زردشتیت کا داخلہ چاہتے تھے!"

اس کے بعد ترقیم ہے:

"چنانچہ رجعت کا اقرار یہودیت کا ظہور رہ ہے، نیز شیعوں کا عقیدہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے آگ ان پر حرام ہے۔" یہودی بھی یہی کہتے ہیں

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ[۱]

(اگر دوزخ کی سزا ہمیں ملے گی بھی تو بس چند روز)

مسیحیت نے یوں جلوے دکھائے کہ بعض شیعوں نے امام کو ذاتِ باری سے بالکل وہی نسبت دیدی جو مسیح کے لئے تجویز کی جاتی ہے، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ امام لاہوت اور ناسوت کا سنگم ہوتا ہے۔ نیز نبوّت و رسالت کا سلسلہ ابدی طور پر ناقابلِ انقطاع ہے، ان کا خیال ہے کہ جو لاہوت سے پیوست ہو جائے وہ نبی ہے۔ اس کے علاوہ تناسخِ ارواح، خدا کی تجسیم اور حلول وغیرہ جو برہمنوں، فلسفیوں اور مجوسیوں کے قدیمی عقائد ہیں، ایک ایک کر کے شیعہ مذہب میں نمودار ہوئے"۔ تا آخر۔!

فضا مکدّر ہوگی، نیز دُنیا ہمیں "واعظ غیر متّعظ" قرار دے گی، اس لئے گفتگو میں تلخی نہیں پیدا کرنا چاہتے۔ ورنہ یہ بتانا بہت آسان تھا کہ اسلام کو غیر اسلامی طریقے اختیار کر کے بربادی کا

[۱] سورۃ آلِ عمران۔ آیت : ۲۴

مُنھ دکھانے والا کون ہے؟ نیز اس وقت بھی وحدتِ دینی کس کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے، مگر نہیں!

البتہ صاحبِ "فجر الاسلام" سے اتنا ضرور دریافت کرینگے کہ دانشمندِ محترم! شیعوں کے کس طبقہ نے اسلام کو تاراج کرنے کی ٹھانی تھی؟ — طبقہ اوّل جس میں سرورِ کائنات ص کے چُنے ہوئے اصحاب ہیں، جیسے سلمانِ محمدی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار، خزیمہ ذوالشہادتین، ابوالتیہان، حذیفہ یمانی، زبیر، فضل ابنِ عباس اور ان کے برادرِ عالی قدر عبداللہ ابنِ عباس، ہاشم ابنِ عتبہ مرقال، ابوایوب انصاری، ابان نیز ان کے بھائی خالد فرزندانِ سعید ابن العاص اموی، ابی ابن کعب اور انس ابن الحرث[۱] جنھوں نے رسولِ مقبول کو یہ فرماتے ہوئے سُنا تھا کہ:

"میرا فرزند حسین ع اس زمین پر شہید ہوگا جسے کربلا کہا جاتا ہے، پس تم میں سے جو بھی اس حادثے کے وقت موجود ہو، وہ ضرور اس کی مدد کو پہنچے"۔ چنانچہ انس نے دسویں محرم کو

[۱] انس بن حارث کے حالات میں امام بخاری نے اپنی تاریخ میں یہ حدیث بیان کی ہے؛ ملاحظہ ہو جلد ۱ صفحہ ۳۰ اور رازی کی "الجرح والتعدیل" کی جلد ۱ صفحہ ۲۸۷ پر بھی درج ہے۔ مجتبیٰ

جامِ شہادت نوش کیا۔ (ملاحظہ ہو "الاصابہ" جلد ۱ صفحہ ۱۵۹، اور "الاستیعاب" جلد ۱ صفحہ ۱۲۳)

زندگانی صحابہ کے موضوع پر یہ دونوں کتابیں سوادِ اعظم کے مستند ترین مؤلفات میں شمار ہوتی ہیں۔

اگر ہم شیعہ صحابیوں کی فہرست مرتب کرنے لگیں نیز ان کا تشیّع ثابت کرنا شروع کر دیں تو اس کے لئے ایک مستقل اور ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ پھر علمائے شیعہ کے مساعیِ جمیلہ سے اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اس سلسلہ میں السلافہ جیسے علمی شاہکار اور طراز اللغۃ جیسے معیاری فرہنگ کے مصنف سید علی خان کا زریں شاہکار "الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعہ" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔[۱]

اگرچہ کہ مرحوم نے "طبقات" میں خاندانِ ہاشم کے نامی گرامی افراد جیسے حمزہؑ، جعفرؑ اور عقیلؑ وغیرہ کے بعد صرف مشہور صحابیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً وہ بزرگ جن کے

۱؎ اس سلسلے میں علامہ سید محسن الامین کی انسائیکلوپیڈیائی تصنیف "اعیان الشیعہ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب ۵۲ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تین جلدوں کا ترجمہ ان کے فرزندِ رشید اور میرے محترم دوست دانشمندِ گرامی الاستاذ سید حسن الامین نے انگریزی میں بھی شائع کر دیا ہے۔ (منجفی)

نام ہم لکھ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ عثمان ابنِ حُنَیف، سہل ابن حُنَیف، ابو سعید خدری، قیس ابن سعد ابن عبادہ رئیسِ انصار، بریدہ، براء ابنِ عازب، خباب ابن الارث، رفاعہ ابنِ مالک، عامر ابنِ واثلہ، ہند ابنِ ابی ہالہ، جعدہ ابنِ ہبیرہ مخزومی اور ان کی والدہ۔ امّ ہانی بنت ابی طالبؑ، بلال ابن رباح مؤذن وغیرہم۔

مگر خیال پڑتا ہے کہ ہم نے اصابہ، اسد الغابہ اور استیعاب جیسے "تراجمِ صحابہ" کے مجموعوں سے تقریباً تین سو شیعہ صحابِ کبار کے اسمائے گرامی جمع کئے تھے، اور ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ نظر اس سے بھی زیادہ طویل فہرست مرتب کر لے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا یہی اکابر اسلام کو برباد کرنے کے آرزومند تھے یا شیعوں کے امام علیؑ ابن ابیطالبؑ، جن کے لئے ثقلین گواہ ہیں کہ اگر وہ بدر و اُحد اور حنین و احزاب میں اپنی تیغِ آبدار کو علم نہ کرتے تو نہ شجرِ اسلام کی کوئی شاخ ہری ہوتی، اور نہ اس کاخِ بلند کا کوئی ستون قائم نظر آتا۔ اسی لئے کہنے والے نے کہا ہے ؎

بنی الدین فاستقام ولولا — ضرب ماضیہ ما استقام البناء

نیز عبد الحمید معتزلی نے تو غلو کی حدیں توڑ دیں۔ فرماتے ہیں:

الا انما الاسلام لولا حسامه ٭ ان کی تلوار نہ ہوتی ......

جی ہاں! اگر ذوالفقار حیدری کی برق باریاں اور ہجرت سے قبل و بعد شیر کردگار کے زہرہ گداز اقدامات نیز مکہ میں مشکل کشا کے والدِ گرامی حضرتِ ابوطالبؑ کی پُرزور اور بے لوث حمایت، علاوہ ازیں سرزمینِ حرم اور ارضِ یثرب پر خود علی مرتضیٰؑ کی غیر معمولی امداد شاملِ حال نہ ہوتی تو قریش کا سرکش گروہ اور عرب کے خونخوار بھیڑیئے ابتداء ہی میں اسلام کا کام تمام کر دیتے۔

لیکن مسلمانوں نے ابوطالبؑ کے احسانات کا یہ صلہ دیا کہ آپ کو دمِ آخر بھی مسلمان قرار دینے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتے۔ اور اس کے برعکس نبیِ اکرمؐ کے تمام مصائب کی بنیاد یعنی ابوسفیان کو خلعتِ اسلام سے نوازنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں! حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس نے انتہائی جبر و اکراہ کے ساتھ مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ حضرت عثمان کو جب خلافت نصیب ہوتی ہے تو ابوسفیان ہی نے چیخ کر کہا تھا:

"فرزندانِ امیہ! خلافت کو گیند کی طرح گوچ لو

میں جس کی قسم کھا سکتا ہوں اسی کی سوگند کہ
نہ بہشت ہے نہ دوزخ!"

بہرحال! جمہور کے فیصلہ کے مطابق یہ زباں دراز تو مسلمان کہا جائے ––– اور ابوطالبؑ! اسلام کا بزرگ ترین معاون جس کے معتقدات کی ایک ہلکی سی جھلک یہ ہے:-

ولقد علمت بأنّ دین محمّدٍ
من خیر ادیان البریّة دینا

"میری دانست میں محمدؐ کا دین یقینی طور پر تمام ادیانِ عالم میں سب سے اچھا دین ہے" (ابوطالبؑ)

سُبحان اللہ! یہ کہنے والا غیر مسلم سمجھا جائے، حالانکہ ابوطالبؑ نہ ایسے بے دست و پا تھے اور نہ اتنے ضعیف الرّائے کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ "محمدؐ کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے"۔ پھر بھی اس کی پیروی نہ کرتے اور وہ بھی محض عوام کے خوف سے! واضح رہے کہ آپ بطحا کی تمام قوتوں اور جملہ توانائیوں کا مرکز تھے۔

خیر آیئے تھوڑی دیر کے لئے "حکایتِ تخریبِ اسلامؑ کا جائزہ لیں۔ اچھا! تو یہ مخربِ دین تھے جن کا ابھی تذکرہ ہو رہا تھا۔ یا ان کے بعد کا طبقہ جسے گروہِ تابعین کہا جاتا ہے اور جس

میں احنف بن قیس، سوید بن غفلہ، عطیۂ عوفی، حکم بن عتیبہ، سالم ابن ابو الجعد، علی ابنِ جعد، حسن ابنِ صالح، سعید ابنِ جبیر، اصبغ ابنِ نباتہ، سلیمان ابنِ مہران اعمش اور یحییٰ ابن یعمر عدوانی وغیرہم شامل ہیں۔ ان کے بعد تبع تابعین کی وہ سربرآوردہ شخصیتیں ہیں، جنھوں نے علومِ اسلامی کی تاسیس کی جیسے ابو الاسود دوٗلی واضعِ علمِ نحو، خلیل ابنِ احمد، موجدِ فرہنگ و عروض، ابو مسلم معاذ ابنِ مسلم الہراء، مؤسسِ علمِ صرف جن کی شیعیت کا اعتراف سیوطی نے بھی کیا ہے۔ (المزہر جلد ۳)
یعقوب ابن اسحاق عربی ادب کے پیشوا۔ نیز مفسرین کی جماعت میں اُمت کے عظیم دانشور جناب عبداللہ ابنِ عباس کا اسمِ گرامی سرِفہرست ہے اور ان کا تشیع مہرِ نیم روز سے بھی زیادہ روشن ہے۔ ان کے بعد جابر ابنِ عبداللہ انصاری ابی ابنِ کعب، سعید ابنِ جبیر، سعید ابن المسیب اور علومِ قرآن کے اولین جامع محمد ابنِ عمر واقدی کے نام آتے ہیں ابنِ ندیم وغیرہ نے ان کے شیعہ ہونے کا اقبال کیا ہے "الرغیب" واقدی کی تفسیر ہے۔

علمِ حدیث کی بنیادیں رکھنے والوں میں سرکارِ رسالتؐ

کے آزاد کردہ غلام اور کتاب الاحکام والسنن والقضایا کے مصنف ابو رافع ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام سے خصوصی ربط رکھتے تھے۔ نیز حضرت کے دورِ حکومت میں مرکزی خزانۂ عامرہ کے "معتمدِ مالیات" تھے، ان کے فرزند بھی اسی سلسلے کے دو نمایاں افراد ہیں ـــ علی ابنِ ابو رافع امیر المومنین علیہ السلام کے سیکریٹری تھے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے باپ کے بعد فقہ میں تصنیف کا کام کیا اور ان کے بھائی عبداللہ ابنِ ابو رافع نے "تاریخ و وقائع نگاری" کی بھی طرح ڈالی۔

جن حضرات نے علمِ کلام کی عمارت کھڑی کی ان میں ابو ہاشم ابن محمد ابنِ حنفیہ کو اولیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ان کی متعدد جلیل القدر کتابوں کا نشان ملتا ہے۔ پھر عیسیٰ ابنِ روضۃ تابعی کے کارنامے سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ اعاظم واصل ابن عطاء اور ابو حنیفہ سے بھی پہلے گذرے ہیں۔ اس ضمن میں سیوطی کا یہ خیال درست نہیں کہ موخر الذکر علمِ کلام کے اولین مصنف تھے۔ بعد ازاں مشہور شیعی اکابر کا دور آتا ہے جن میں قیس الماصر، محمد ابن علی احول معروف بمؤمن طاق، ہشام ابنِ حکم

اور آل نوبخت شامل ہیں۔ یہ گرامی مرتبت خاندان سو سال سے زیادہ عرصہ تک مذہب و ملت کی خدمت انجام دیتا رہا۔ ان کے مصنفات میں فصّ الیاقوت" وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نیز ہشام، احول اور الماصر کے تلامذہ ابوجعفر سکّاک بغدادی، ابومالک ضحاک خضرمی، ہشام ابن سالم، یونس ابنِ یعقوب وغیرہم کے اسماءِ گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے "دہریوں" سے تبادلۂ فکر و نظر کرکے انھیں زبردست ذہنی شکستیں دیں اور توحید و امامت جیسے عناوین کے لئے ناقابلِ تردید ثبوت مہیا فرمائے۔

اگر کوئی شخص ان حضرات کے جملہ کلامی مُباحث کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو ہمارے علمی ذخیروں کی زینت ہیں تو ہر متکلم کے افادات کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیئے خصوصاً ہشام ابنِ حکم کے مناظرات! اسی طرح اگر ہم تمام شیعہ فلاسفہ اور متکلمین کا شمار کرنا چاہیں تو کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں گی۔

اَب فرمائیں "فجر الاسلام" کے مصنف کہ یہ لوگ دینِ خُدا کی تباہی کے خواہشمند تھے یا وہ ہوش مند تھے جنھوں نے

سیر و آثار کی حفاظت میں رات دن ایک کرکے حضور ختمی مرتبت ؐ کی زندگی، معجزے، غزوات اور حُسن کردار کے نمونوں کو جمع کرنے کی سعی فرمائی؟ اِس زمرے میں عالمِ اسلامی کی پہلی شخصیت ابان ابنِ عثمان الاحمر تابعی (متوفی ۱۴۰ھ) یہ امام جعفر صادق علیہ السّلام کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد ہشام ابنِ محمد، محمّد ابن سائب کلبی، محمّد ابن اسحٰق مطلبی اور ابومخنف ازدی کے شاہ کار سامنے آتے ہیں۔ بعد کے تمام لکھنے والے اِس فن میں ان کے محتاج رہے۔

مورّخین کی فہرست پر نگاہ کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ کُل بلند پایہ قلم کار شیعہ تھے۔

مثلاً "کتابُ المحاسن" کے مؤلف احمد ابن محمّد ابنِ خالد برقی، نصر ابنِ مزاحم منقری، ابراہیم ابن محمد ابنِ سعد ثقفی، عبدالعزیز جلودی بصری امامی، احمد ابنِ یعقوب جن کی تاریخ "الیعقوبی" یورپ میں شائع ہو چکی ہے۔ محمّد ابن زکریا، ابوعبداللہ الحاکم "مروج الذہب" کے مصنف "المسعودی"۔ "آداب السّلطانیہ" کے مؤلف محمّد ابنِ علی ابنِ طباطبا اور ان جیسے سینکڑوں افاضل ہیں جن کے شمار کا موقع نہیں۔

پھر مشہور ادباء کا جائزہ لیجئے تو ان میں بھی شیعوں ہی کو اکثریت حاصل ہے۔ ارباب سخن کے مختلف طبقے ہیں:۔

پہلا طبقہ:

اس میں زیادہ تر اصحاب ہیں، اور اس سلسلے کے جتنے مشہور سخن سنج ہیں وہ سب کے سب تشیع سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نابغہ جعدی۔ یہ صاحب ذوالفقار کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور اس معرکہ میں جو رجز کہے ہیں وہ کافی شہرت رکھتے ہیں۔ عروہ ابن زید الخیل انھوں نے بھی حضرتؑ کے ساتھ صفین میں شرکت کی تھی (ملاحظہ ہو الاغانی) لبید ابن ربیع عامری ادباء کی ایک بڑی جماعت نے ان کی شیعیت کا اقرار کیا ہے۔ ابوالطفیل عامر ابن واثلہ ابوالاسود دؤلی۔ اور "بانت سعاد" کے مصنف کعب ابن زہیر و امثالہم۔

دوسرا طبقہ:

تابعین کا معاصر ہے۔ اس جماعت میں فرزوق کمیتؔ کثیر عزّہ، سید حمیری اور قیس ابن ذریح وغیرہم کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

تیسرا طبقہ:

دوسری صدی ہجری سے متعلق ہے۔ اس میں دعبل خزاعی، ابونواس، ابوتمام بحتری، دیک الجن، عبدالسلام، ابوالشیص، حسین ابن ضحاک، ابن رومی، منصور نمری، اشجع سلمی، محمد ابن وہب اور صریع الغوانی کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ نیز مروان ابن ابی حفصہ اور اس کی ذریت کو چھوڑ کر عباسی دور کے تمام بڑے ادیب شیعہ ہی تھے۔ اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر مثلاً مغرب کے ابن ہانی اندلسی، ابن التعاویذی صاحب مجنون، حسین ابن الحجاج، مہیار دیلمی اور امیر الشعراء، ابوفراس حمدانی جن کی بابت یہاں تک کہا گیا ہے کہ "شعر کی ابتداء بادشاہ سے ہوئی اور خاتمہ بھی بادشاہ پر ہوا۔" نیز کشاجم، ناشئ صغیر ناشئ کبیر، ابوبکر خوارزمی، بدیع ہمدانی، طغرائی، شمس الخلافہ جعفر، عمارۂ یمنی، وداعی، زاہی، ابن بسام بغدادی سبط ابن تعاویذی سلامی اور نامی بلکہ "یتیمۃ الدہر" ثعالبی (جو چار جلدوں پر مشتمل ہے) کے بیشتر اساتذۂ فن شیعہ ہیں۔

حقیقت یہ کہ اصناف ادب میں شیعوں نے اتنا عروج حاصل کیا کہ سخن شناسوں کو یہ کہنا پڑا کہ:

"کیا شیعوں کے علاوہ بھی کوئی ادیب ہوتا ہے!؟"

نیز تحسینِ کلام کے سلسلے میں یہ کہاوت تو عربوں میں عام ہوگئی تھی کہ: "وہ سخنور تو اپنے شعر سے بالکل شیعہ لگتا ہے"
کچھ لوگوں نے متنبیؔ اور ابوالعلاء کو بھی شیعہ لکھا ہے۔ نیز سند کے طور پر ان کے بعض اشعار کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔

(ملاحظہ ہو المراجعات الریحانیہ" جلد ۲)

ہاں ان طبقوں میں خاندانِ قریش کے شیعہ شعراء جیسے فضل ابنِ عباس جن کے حالات "الاغانی" میں درج ہیں، ابودہبل جمحی، وہب ابن ربیعہ۔ علاوہ ازیں خاص علوی ادیب بھی مثلاً شریف رضی و مرتضیٰ، شریف ابوالحسن علی حمانی فرزند شریف اور محمد ابن جعفر ابن محمد ابن زید ابن علی ابن الحسین علیہم السّلام کے اسمائے گرامی شامل نہیں ہیں۔

شریف حمانی فرماتے تھے "میں شاعر میرے باپ شاعر، میرے دادا شاعر" محمد ابنِ صالح علوی نہایت بلند مرتبہ ادیب تھے۔ ابوالفرج اصفہانی نے ممدوح کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے گراں مایہ نتائجِ فکر کا بھی تعارف کروایا ہے۔ اسی طرح شریف ابن شجری وغیرہ یہ

سب علوی سلسلہ کے ممتاز ہنرمند ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے "نسمۃ السحر ممن تشیّع وشعر" کا مطالعہ مفید ہوگا، شریف یمانی کے اس وقیع شاہ کار میں نہ صرف علوی ادیبوں ہی کا خاطر خواہ تذکرہ ہے بلکہ اموی گھرانے کے شیعہ شعراء کے حالات بھی موجود ہیں۔ مثلاً عبدالرحمٰن ابنِ حکم، خالد ابنِ سعید ابنِ عاص، مروان ابنِ محمد سروجی اموی جن کا ذکر کرتے ہوئے زمخشری نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں غالباً یہ ابیات بھی درج کیے ہیں:۔

یا بنی ہاشم ابنِ عبد منافٍ — انّنی منکم بکلّ مکانِ
انتم صفوۃ الالٰہ ومنکم — جعفرٌ ذوالجناح والطیرانِ
وعلیٌ وحمزۃ اسد اللہ — وبنت النبیّ والحسنانِ
ولئن کنت من امیۃ انّی — لبریءٌ منھم الی الرحمٰنِ

- "اے آلِ ہاشم ابنِ عبدِ مناف میں جہاں بھی ہوں تمہارا ہوں۔"
- "تم خاصانِ خدا ہو، اور جعفرِ طیار تمہارے ہی کنبے کے بلند پرواز فرد ہیں۔"
- "علیؑ شیرِ کردگار، حمزہؑ، دخترِ رسولؐ اور حسنینؑ تمہارے ہی خاندان کی شخصیتیں ہیں۔"

◆ "ہاں! میں اگرچہ کہ اُموی نژاد ہُوں لیکن حاشا! کھینچتا ہُوں کہ مجھے بنو اُمیّہ سے کوئی واسطہ نہیں!"

اسی طرح نجدیات و عراقیات کا شہرت یافتہ مصنّف ابیوردی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ اِن کے علاوہ اس سلسلے کے اور بھی بہت سے مشاہیر ہیں مگر چونکہ یہ کتاب قلم برداشتہ لکھی جارہی ہے، بنابریں سب کے حال احوال کی تشریح مشکل ہے۔

نیز جب بڑے بڑے فرماں رواؤں، عظیم سیاستدانوں اور مدبّر وزراء کی تاریخ سامنے آتی ہے تو یہاں بھی شیعہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ فاطمی اور بویہی حکمرانوں کے علاوہ آلِ حمدان، بنی مزید، بنی دبیس، عمران ابنِ شاہین، مقلد ابنِ مسیّب عقیلی اور قرواش ابنِ مسیّب جیسے سلاطین شیعہ ہی تھے۔ نیز وجیہ الدولہ ذوالقرنین تغلبی اور مغرب و افریقہ کے فرماں روا تمیم ابنِ معز کی شیعیّت بھی کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں۔ اِس فہرست میں بھی مزید بہت سے نام آسکتے ہیں۔

اور وزراء کی صف میں تو سب شیعہ ہی شیعہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسحٰق کاتب، غالباً یہ پہلے شخص ہیں جن کے لئے رسمی طور پر "وزیر" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابوسلمہ خلاّل کوفی، یہ پہلے عبّاسی خلیفہ کے پہلے وزیر تھے۔ سفّاح نے ان کی

انتظامی قابلیت کے پیشِ نظر سلطنت کے جملہ اُمور حوالے کردیئے تھے۔ ابوسلمہ نے وزیرِ "آلِ مُحمّد" کے لقب سے شہرت پائی لیکن پھر آلِ محمّد کی دوستی ہی کے باعث سفّاح کے سفّاک ہاتھوں سے شہید ہوئے۔ ابوعبداللہ یعقوب ابنِ داؤد مہدی عبّاسی کے وزیر تھے، خلیفہ نے پُورا نظم و نسق ان کو سونپ دیا تھا۔ یہ شعر انھیں کے متعلق ہے ؎

بنی اُمیّۃ ھبّوا طال نومکم

اِنّ الخلیفۃ یعقوب ابنِ داؤد

◆ "بنی اُمیّہ! اُٹھو، خوابِ گراں سے بیدار ہو۔ دیکھو اَب خلیفہ یعقوب ابنِ داؤد ہے!"

آخر میں انھیں بھی زندان کی صُورت دیکھنا پڑی۔ آلِ نوبخت اور بنی سہل تو وزارت کے گھرانے ہی کہلاتے ہیں۔ فضل ابنِ سہل، حسن ابنِ سہل، مامون رشید کے وزراء تھے۔ اسی طرح بنو الفرات میں سے حسن ابنِ علی دورِ مقتدر میں تین مرتبہ وزارت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ابوالفضل جعفر ابوالفتح فضل ابنِ جعفر اور فرزندانِ عمید محمّد ابنِ حسین اور ان کے بڑے بیٹے ذوالکفایتین، ابوالفتح علی ابنِ محمّد رکن الدولہ کے وزیر تھے۔ طاہر خزاعی کی اولاد کو مامون نے وزارت سپرد کی۔

مہلبی، ابو دلف عجلی، صاحب ابنِ عباد اور عظیم سیاستدان ابو القاسم وزیر مغربی۔ ابو عبد اللہ حُسین ابن زکریا جو "شیعی" کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں، ان کے سوا ابراھیم صولی طلائع ابنِ زریک، مصر کے سپہ سالار افضل اور ان کے فرزند ابو الحسن جعفر ابنِ محمدؒ ابنِ فطیر، ابو المعالی ہبۃ اللہ وزیر مستنصر اور موید الدین محمد ابن عبد الکریم قمی پہلے ناصر کے، پھر طاہر کے وزیر ہوئے۔ اس کے بعد مستنصر نے وزارت پیش کی جس ابنِ سلیمانؒ "برامکہ" کے عہد میں چیف سیکرٹری Chief Secretary تھے۔ یہ بھی "شیعی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

نیز مصنفؒ "الاوراق" صولی، یحییٰ، ابنِ سلامہ حصفکی اور صاحبِ "فہرست" ابنِ ندیم کی تحریر کے مطابق ابو جعفر احمد ابنِ یوسف اور ان کے بھائی ابو محمد ابنِ قاسم کے اہلِ بیتؑ کی شان میں کہے ہوئے قصائد و مراثی آپ اپنی نظیر ہیں اور ملاحظہ ہو صولی کی "الاوراق"۔ یہ مامون کے زمانے میں معتمدِ عمومی تھے بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی یہ عہدہ ان کے پاس رہا اسی طرح ابراہیم یوسف اور ان کے فرزند نیز عربی زبان کے ناخدا اور "معجم" کے مصنف ابو عبد اللہ محمد ابنِ عمران مرزبانی

کا نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ سمعانی نے ان کے تشیع کا ذکر کیا ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس، سینکڑوں ہستیاں ہیں جن کی انتظامی قابلیت، سیاسی بصیرت اور قومی خدمات کا ریکارڈ Record پیش کرنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

ہمارے والد علاّم نے شیعوں کے مختلف طبقوں کے حالات جمع کرنے کی کوشش فرمائی تھی، چنانچہ دس جلدوں میں علماء، حکماء، سلاطین، وزراء، ہیئت داں اور اطبّاء وغیرہ جیسے بیس طبقوں پر حروفِ تہجّی کے مطابق روشنی ڈالی ہے، اِس مجمُوعہ کا نام ہے "الحصون المنیعہ فی طبقات الشیعہ" مگر حق یہ کہ یہ ضخیم تالیف بھی جامع نہیں۔

اِس منزل پر پھر ہم صاحبِ "فجر الاسلام" سے دریافت کریں گے کہ آپ کے خیال میں یہی حضرات جنھوں نے معارفِ اسلامیہ کو پروان چڑھایا، اور علم و دانش کو اِستحکام بخشا۔ دینِ متین کو منہدم کرنے کے درپے تھے؟ اور پھر یہ سوال کہ آپ اور جناب کے استاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین مذہب اسلام کے حامی ہیں؟ اگر یہی صورتِ حال ہے تو اس زندگی پر صد حیف اور اِسلام کو

سلام ! بلکہ بقولِ شاعر جب حاتم کو بھی بخیل کہا جانے لگے تو بہتر ہوگا کہ ع

موت آجائے، کہ قصّہ پاک ہو!

حقیقت یہ ہے کہ مدعائے تحریر یہ نہ تھا۔ لیکن خامہ چل پڑا اور بہت سی باتیں بیچ میں آگئیں۔ لیکن شاید حال و استقبال کے اہلِ قلم اس سے کچھ متاثر ہوں اور کم از کم ان میں تحریر کا سلیقہ اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے اظہار کی صلاحیت آجائے۔

حکیمِ اسلام حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام ارشاد فرماتے ہیں :

" دانش مند کی زبان اس کے دِل کی تابع ہوتی ہے
اور جاہل کا دِل اس کی زبان کا فرماں بردار ہوتا ہے"

احمد امین کا یہ قول کہ " رجعت کے عقیدہ سے تشیع میں یہودیت نے ظہور کیا" انتہائی اندوہناک ہے۔ کاش! وہ بتا سکتے کہ رجعت شیعوں کا کوئی اساسی مسئلہ ہے یا ان کے مذہب کا کوئی بنیادی رکن؛ جسے نکتہ چینی کا موضوع بنایا گیا ہے؟ کسی فرقے کے بارے میں جس کسی کی بھی معلومات کا یہ عالم ہو تو کیا اس کے لئے یہ

مناسب نہیں کہ وہ سکوت اختیار کر کے اپنا بھرم قائم رکھے۔

واقعہ یہ کہ عقیدۂ رجعت لازمۂ تشیّع نہیں۔ البتہ اس کا اقرار ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمام اسلامی حلقوں میں اخبارِ غیب ، علاماتِ قیامت مثلاً حضرت عیسیٰ کی آمد اور خروج دجّال وغیرہ کا اعتبار ہے۔ لیکن نہ یہ باتیں عین اسلام ہیں نہ ان کا انکار اسلام سے خارج ہونے کا سبب اور نہ ہی ان کا مجرّد اعتراف کسی کے مُسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ یہی کیفیت عقیدۂ رجعت کی ہے نیز اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس کا تعلق شیعوں کے اصُول سے ہے تو کیا کسی یہودی مسئلہ سے اتفاق کو یہودیت سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ مُسلمان توحید کے قائل ہیں۔ یہودی بھی ایک ہی معبود کی پرستش کرتے ہیں۔ تو کیا اس اشتراکِ خیال سے اسلام کو یہودیت سے وابستہ کرنے کی جراءت کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

اِس عقیدے کے سلسلہ میں مطعون کرنے والوں کو نہ معلوم کیا غیر معمولی شئے نظر آتی ہے، جو اس درجہ جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

" خُداوند عالم ایک گروہ کو دوبارہ زندگی عطا کریگا"

یہ کون سا محال کام ہے؟ کیا کسی نے کلامِ الٰہی میں یہ قصہ کبھی نہیں پڑھا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ [1]

"(کیا تم نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے! لیکن خدا نے کہا مر جاؤ اور انھیں موت آگئی۔ اس کے بعد پھر اس نے انھیں زندگی بخش دی)"

اور یہ آیۂ کریمہ بھی کسی کی نظر سے نہیں گذری؟

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا [2]

"(اور جس دن ہم ہر اُمّت سے ایک گروہ کو اٹھائیں گے)"

اگر اس سے مُراد قیامت لی جائے تو قیامت کے روز تو ہر قوم سے ایک گروہ نہیں بلکہ تمام اُمّتیں محشور ہوں گی!

یہ آج کی بات نہیں، علمائے جمہور صدرِ اوّل ہی سے اس

---

[1] البقرہ، پ۲۔ آیت: ۲۴۳

[2] النمل، پ۲۰۔ آیت: ۸۳

مسئلہ کو ہدفِ ملامت قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ اس ضمن میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کبھی جلیل القدر شیعہ راوی یا محدث کے اعتبار و اعتماد کو مجروح کرنے کا کوئی موقعہ نہیں پاتے تو کچھ اس انداز سے رجعت کا اُلہنا دینے لگتے ہیں جیسے کسی پر بُت پرستی یا شرک کا الزام لگایا جا رہا ہو۔

زیرِ بحث معاملہ میں مومن طاق اور ابو حنیفہ کا واقعہ خاصی شہرت رکھتا ہے۔

بہر حال میرے نقطۂ نظر سے یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے ثابت کرنے کی جدّ و جہد کی جائے۔ چنانچہ غلط اندیش لوگوں کی صرف ذہنی بے راہ روی ہی منکشف کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

"فجر الاسلام" کے مصنف فرماتے ہیں کہ — مجموعی طور پر آگ شیعوں کے لئے حرام ہے" — خدا معلوم یہ نظریہ شیعوں کی کس کتاب سے ڈھونڈ نکالا۔ کاش فاضل قلم کار کو نقد و نظر ہی کا کچھ خوف ہوتا۔ اور وہ اپنے ادّعا کے لئے کوئی ثبوت ضروری سمجھتے۔

شیعوں کی کتابیں، ان کے مؤلفات علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ: "جنّت" اللہ کے فرماں بردار بندے کا انعام ہے

خواہ وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور دوزخ سرکش عنصر کا حصہ ہے چاہے اس میں قریشی سید ہی کیوں نہ شامل ہو۔"

اس مضمون کی روایتیں ان کے آئمہ سے مروی ہیں اور اس حد تک کہ شمار مشکل! البتہ مسئلہ شفاعت ایک علیحدہ چیز ہے، جس کے تمام مسلمان قائل ہیں۔

مگر ہم پھر کہیں گے کہ اگر اسے بھی شیعوں کا عقیدہ تصور کر لیا جائے تب بھی یہ یہودیت کا ظہورہ کیسے ہوا؟

جناب ابو حنیفہ نکاح کے بعض مسائل میں "مجوسیوں" سے اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کسے زیب دے گا کہ امام احناف نے اپنی فقہ کی بنیاد مجوسیت پر قائم فرمائی ہے اور مزید ثبوت کے لئے آپ کے عجم نژاد ہونے سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ غرض کہ یہ سب جذباتی طور طریقے ہیں جن سے بس! آپس میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کی حسرتیں پوری کی جاتی ہیں۔

شیعہ مذہب میں مسیحیت کے اثر کا طعنہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ دیانت داری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ احمد امین کوئی حوالہ سپردِ قلم کرتے۔ لیکن غالباً انہوں نے خطابیہ، غرابیہ، علیاویہ، مخمسہ، بزیعیہ اور غلات جیسے فرقوں کو بھی

شیعہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ قرامطہ کی طرح ان ملحد گروہوں کو فرقہ شیعہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ امامیہ شیعہ اور ان کے دینی پیشوا ان تمام مکاتب سے بے تعلق ہیں کیوں کہ مذکورہ جماعتیں عیسائیوں کی طرح نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ امام خود ذاتِ باری ہے۔ خواہ "یہ ظہور" کی شکل میں ہو یا "اتحاد و حلول" کی صورت میں وغیرہ وغیرہ، ان کے یہ غلط افکار متصوفین کے عقائد و مسلمات سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ مشہور مشائخ طریقت جیسے حلاج، گیلانی، رفاعی اور بدوی وغیرہم کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو اس منزل پر فائز سمجھتے تھے، جو ان کی دانست میں ربوبیت سے بلند تر اور مقامِ الوہیت سے زیادہ اونچی تھی۔

وحدت الوجود کے قائل بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے تصورات کے حامل ہیں۔

مگر امامیہ شیعہ جو کروڑوں کی تعداد میں عراق ایران ذیلی برِاعظم ہندو پاکستان اور افغانستان میں آباد ہیں، وہ بحیثیت شیعہ ان تمام خرافات سے بری نیز ان جملہ مزخرفات کو کفر و ضلالت شمار کرتے ہیں۔

ان کا مذہب توحیدِ خالص ہے۔ نہ وہ ذاتِ اقدس

الٰہی میں مخلوق کی کسی مشابہت کے قائل ہیں اور نہ اس کے صفاتِ کاملہ میں کسی نقص و تغیر کے روادار بلکہ وجوب، وجود، قِدَم، ازلیّت اور تنزیہ و تقدیس کے منافی ہر تصور کو باطل قرار دیتے ہیں۔

شیعوں کا کلامی ذخیرہ ان بلند نظریات سے مملو ہے۔ اِس سلسلے میں مختصر سے مختصر کتاب جیسے "تجرید" یا بڑی سے بڑی تصنیف مثلاً "اسفار" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

نیز ان کے علاوہ اور ہزاروں کتب موجود ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، اور ان کے اکثر ابواب تناسخ، اتحاد، حلول اور تجسیم کی رد کرتے ہیں۔

بہرحال صاحبِ "فجر الاسلام" نے شیعوں پر انتہائی غلط الزامات عائد کر کے مذہب و ملّت کی کوئی صحیح خدمت انجام نہیں دی۔ چونکہ ہم اِس کتاب کا تعاقب نہیں کرنا چاہتے۔ اِس لئے مزید لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور یہ چند باتیں بھی محض نمونے کے طور پر پیش کی گئیں تاکہ دُنیا کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ جب سوادِ اعظم کے علماء اور اہلِ قلم کا یہ حال ہے تو بے سواد عوام کی کیا کیفیت ہو گی۔

مصیبت یہ کہ شیعوں کے متعلق لکھنے والے عام طور پر

ابنِ خلدون بربری اور احمد بن عبد ربّہ اندلسی جیسے دُور افتادہ علاقوں کے خامہ فرساؤں کو ماخذ قرار دیتے ہیں یا پھر عصرِ حاضر کے قلم کار روشن خیالی کے زعم میں ولہوزن اور ڈوزی وغیرہ کو حجّت سمجھتے ہیں، مگر کوئی بندۂ خدا شیعوں کے علمی ذخیرے کی جانب توجہ دینے کی زحمت نہیں گوارا کرتا۔ نتیجہ یہ کہ جب کوئی شیعہ ان افاضل کی تصانیف کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے بارے میں اسی قسم کی کچھ تُک بندیاں دِکھائی دیتی ہیں۔ جن کا تذکرہ راغب اصفہانی نے کسی موقعہ پر اپنی کتاب "المحاضرات" میں کیا ہے۔ موصوف ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ جعفر ابنِ سلیمان کے دربار میں ایک مسلمان کسی دُوسرے کے کفر کا گواہ تھا۔ جب اس سے پُوچھا گیا کہ مدّعی کے متعلق کیا جانتے ہو تو اُس نے بیان دیا کہ:

"یہ شخص معتزلی ہے، ناصبی ہے، حروری ہے۔ جبری ہے، رافضی ہے، علی ابنِ خطاب، عمر ابنِ ابی قحافہ، عثمان ابنِ ابی طالب اور ابوبکر ابنِ عفّان کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ نیز کوفہ کو ابوسفیان پر ڈھانے والے اور قطائف کے دِن (یوم طف =

روزِ عاشور) حسین ابنِ معاویہ سے جنگ کرنیوالے حجاج کو گالیاں دیتا ہے۔"

یہ سُن کر جعفر نے کہا:

"خدا سمجھے تجھ سے! نہ جانے میں تیری کس چیز پر رشک کروں، تاریخ دانی پر، مذہب شناسی پر، یا جغرافیائی معلومات پر!"

رہ گیا عبداللہ ابنِ سبا" جسے شیعوں کے ساتھ چپکایا جاتا ہے' یا شیعہ فرقہ کو اس سے چپکانے کی کوشش کی جاتی ہے، اِس ضمن میں شیعوں کی کسی بھی کتاب کا مطالعہ کرلیا جائے، تمام مؤلفات میں اس شخص سے بیزاری کا اعلان ملے گا، بلکہ رجالِ شیعہ میں اس کے متعلق جو ملائم سے ملائم جملہ نظر آئے گا وہ یہ کہ "عبد اللہ ابنِ سبا العن من ان یذکر"

اس سلسلہ میں بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ عبداللہ ابنِ سبا مجنون عامری اور ابو ہلال جیسے کردار' داستان سراؤں کے افسانوی ہیرو ہیں۔ اموی اور عباسی سلطنتوں کے وسطی دور میں عیش و عشرت اور لہو و لعب کو اتنا فروغ حاصل ہو گیا تھا کہ ـــــ داستان گوئی اور افسانہ سرائی محل

نشینوں اور آرام طلبوں کا جزوِ زندگی بن گئی تھی، چنانچہ اس قسم کی بھی کہانیاں ڈھل گئیں۔

ہمارا مقصد تجزیۂ احوال نہیں لیکن عصرِ حاضر کے مُصنّفوں کے پے در پے حملوں کو دیکھ کر یہ ضروری سمجھا کہ مختصر طور پر شیعوں کے "عقائد و مسلّمات" اور ان کے اہم اصول و فروع اور اجماعی مسائل کا تعارف کروا دیا جائے۔ خیال رہے کہ شیعہ مذہب میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور جہاں تک اجماع، کتاب، سنت اور ضروریاتِ عقل کی مخالفت نہیں ہوتی۔ ہر مجتہد اپنی رائے میں آزاد ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر استنباط کرنے والے کو گمراہ تصور کیا جائے گا، اور ایسے شخص کی رائے قطعی طور پر ذاتی، انفرادی اور ناقابلِ عمل سمجھی جائے گی۔

ان اوراق میں تمام مسائل کی تفصیل کا موقعہ نہیں! چنانچہ یہاں صرف وہ کلیات پیش کیے جائیں گے جو شیعیت کا محور اور جن میں اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں۔

دلائل و براہین کی جانب بھی زیادہ توجہ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ یہ بڑی کتابوں ہی کے لیے مناسب ہے۔ نیز ہماری غرض و غایت صرف یہ ہے کہ تمام مسلمان انفرادی

اور اجتماعی طور پر شیعوں کے حقیقی معتقدات سے آگاہ ہوجائیں اور وہ اپنے بھائیوں کی جانب غلط عقائد کی نسبت دے کر خود پر ظلم نہ کریں، اور نہ انھیں بھوت، پریت، دیو، جنّ، وحشی اور آدم خور سمجھ کر اپنے معاشرے سے الگ سمجھیں۔ کیونکہ خدا کے فضل و کرم سے شیعیانِ حیدرِ کرارؑ آدابِ اسلامی سے آراستہ، تعلیماتِ قرآنی سے پیراستہ، نعمتِ ایمان سے سرفراز اور مکارمِ اخلاق سے مالامال — کتاب و سنت پر ایمان اور اصولِ عقل پر ایقان رکھتے ہیں۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ خداوندِ عالم جذبات سے کھیلنے والوں کو سوچنے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور وحدتِ اسلامی کو استحکام حاصل ہو۔

نجفِ اشرف

محمد الحسین آلِ کاشف الغطاء

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۰ھ

شیعیت

کی

ابتداء اور ارتقاء

تاریخ آغاز

تشیع کوئی نیا مذہب نہیں۔ جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے وہیں سے شیعیت کی بھی اِبتدا ہوتی ہے۔ چمن آرائے شریعت یعنی سرکارِ خاتم الانبیاءؐ نے اسلام کے ساتھ ہی ساتھ اپنے ہی ہاتھوں یہ پودا لگایا، آبیاری کی اور خود حضورؐ ہی اس کی نگہداشت فرماتے رہے۔ پودا بڑھ کر ہرا بھرا درخت ہوا، اور رسولِ مقبولؐ کی زندگی ہی میں پھولنے بھی لگا، مگر پھلنے نہ پایا تھا کہ چراغِ نبوت گُل ہو گیا۔

حدیثِ دیگراں

اِس دعوے میں ہم منفرد نہیں بلکہ سوادِ اعظم کے بڑے بڑے علماء بھی ہمارے ساتھ شریک ہیں چنانچہ علامہ سیوطی اپنی مشہور تفسیر "درِّ منثور" میں بضمن قول باری تعالیٰ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ "سورۂ بیّنہ۔ پ ۳۰۔ آیت: ۷ (وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں) تحریر فرماتے ہیں:

"ابن عساکر جابر ابنِ عبداللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں، ہم رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر تھے، کہ سامنے سے علیؑ نمودار ہوئے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کو دیکھ کر فرمایا۔ "قسم ہے اُس پاک پروردگار کی جو میری جان کا مالک ہے کہ قیامت میں یہ اور ان کے شیعہ ہی کامیاب رہیں گے۔" [۱]

---

[۱] اخرج ابن عساکر عن جابر بن عبد اللّٰہ قال کنّا عند النّبی صلّی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلّم فاقبل علیٌّ فقال النّبی صلّی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلّم۔ والّذی نفسی بیدہٖ انّ ھٰذا وشیعتہ لھم الفائزون یوم القیٰمۃ۔
یہ حدیث صواعق محرقہ کے صفحہ ۹۳، اور ابن صبّاغ مالکی کی الفصول المہمہ کے صفحہ ۱۲۲ پر بھی مرقوم ہے۔

ابنِ عدی ابنِ عباس سے ناقل ہیں کہ جب آیۂ وافی ہدایہ "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" نازل ہوئی تو حضرت ختمی مرتبتؐ نے علی ابنِ طالب سے ارشاد فرمایا کہ:

"اِس سے مُراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں، جو قیامت میں خوش و خرم ہوں گے۔"

ابنِ مردویہ نے خود حضرت علی علیہ السّلام کی زبانی اِس حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرت کا بیان ہے کہ ــــــ سرورِ عالم نے مجھ سے فرمایا۔ "اے علیؑ! کیا تم نے خداوندِ عالم کا یہ ارشاد نہیں سُنا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ [۱] (اس سے تم اور تمہارے شیعہ ہی مُراد ہیں۔ میرا اور تم لوگوں کا وعدہ حوضِ کوثر پر پُورا ہوگا، اور اس وقت جب کہ تمام اُمّتیں حساب پیش کرنے

---

[۱] "جو لوگ ایمان لائے، اور جنھوں نے نیک عمل کئے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔" سورۂ بیّنہ۔ پ ۳۰۔ آیت: ۷

کے لئے حاضر ہوں گی تم لوگ تابندہ جبیں، روشن قدم کہہ کر بُلائے جاؤ گے "

یہ سیوطی کی ترقیم کردہ روائتیں تھیں۔

ابنِ حجر مکّی نے بھی ان میں سے بعض احادیث کو دارقطنی کے حوالے سے "صواعق محرقہ" میں درج کیا ہے، اور جناب اُمِ سلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ " اے علیؑ تمھیں اور تمھارے شیعوں کو جنّت نصیب ہو گی ۲؎

ابنِ اثیر نے بسلسلہ لفظ "قمح" لکھا ہے کہ رسولِ کریمؐ نے حضرتِ علیؑ سے فرمایا:

" بارگاہِ ایزدی میں جب حاضری ہو گی تو تمھارے ساتھ تمھارے شیعہ بھی شاد کام آئیں گے اور دشمنوں کا یہ حشر ہو گا کہ غضب میں مبتلا اور ہاتھ پسِ گردن سے بندھے ہوئے ہوں گے" اس کے بعد آں حضرتؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں

۲؎ یا علیّ اَنتَ وَ اَصحابُکَ فِی الجَنَّۃِ۔

کو گردن کے پیچھے لے جاکر بتایا کہ دیکھو! یُوں بندھے ہوں گے" ۱؎

غالباً یہ حدیث ابنِ حجر نے "صواعق" میں بھی درج کی ہے ۲؎ اور دُوسرے علماء نے بھی اسے مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جو اس کی شہرت کا ثبوت ہے ـــ زمخشری کی "ربیع الابرار" میں سرکارِ دوعالمؐ کا یہ ارشاد نظر آتا ہے:

" اے علیؑ قیامت کے دن دامن رحمتِ باریؑ میرے ہاتھ میں ہو گا، اور میرا دامن تمھارے ہاتھ میں، تمھارا دامن تمھاری اولاد تھامے گی اور تمھاری اولاد کے شیعہ ان کے دامن سے متمسک ہوں گے۔ اِس کے بعد دیکھنا ہمارے لئے کیا حکم ہوتا ہے ۳؎۔"

۱؎ وفی حدیث علیؑ قال لہ النبی ستقدم علی اللہ انت و شیعتک راضین مرضیین ویقدم علیہ عدوک غضاباً "مقمحین" ثم جمع یدہ الیٰ عنقہ یریھم کیف "الاقماح"۔

۲؎ صواعقِ محرقہ، صفحہ ۱۵۹

۳؎ قال یا علی اذا کان یوم القیامۃ اخذت بحجزۃ اللہ واخذت انت بحجزتی واخذ ولدک بحجزتک واخذت شیعۃ ولدک بحجزتھم فتری این یؤم بنا؟

مزید اطمینان کے لیے مسند احمد بن حنبل اور خصائص نسائی وغیرہ کا مطالعہ سود مند ہوگا۔ جن میں ایسی حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

قابلِ غور

مذکورہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ بارہا شیعیانِ علیؑ کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی اس خصوصیت کی جانب بھی اشارے فرماتے ہیں کہ یہ قیامت کے دن محفوظ رہیں گے کامیاب ہوں گے اور خوش خوش نظر آئیں گے۔

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ختم المرسلینؐ کو پیکرِ صداقت اور آیۂ "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" کا مصداق سمجھتا ہے۔ کم از کم اس نے تو ان اقوال کو ضرور سرمایۂ ایمان تصور کیا ہوگا۔ اور اگر کسی وجہ سے اس وقت رسولؐ کی پوری محفل علیؑ کا ساتھ دینے کے لئے نہ تیار ہوئی ہوگی تو کچھ اصحابِ کرام تو یقیناً ان اوصاف سے متصف ہونے کے لئے علیؑ کا دم بھرنے لگے ہوں گے۔ تاریخی واقعات کی چھان بین کی جائے تو اس مفروضے کی خاصی تائید ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ نبوی ہی میں بزرگ اصحاب کا ایک گروہ جناب امیرؑ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حضرتؑ کو اپنا روحانی پیشوا، تعلیمِ رسولؐ کا حقیقی مبلّغ نیز احکام و اسرارِ نبوت کا واقعی شارح و مفسّر بھی تسلیم کرتا ہے، اور شیعہ کے نام سے شہرت پاتا ہے۔

اربابِ لغت بھی اس حقیقت کے حامی ہیں۔ مشہور فرہنگ "نہایہ" اور "لسان العرب" اٹھا کر دیکھئے شیعہ کے معنی ہی یہ ملیں گے کہ یہ اس فرقہ کا اسمِ خاص ہے، جو علیؑ اور اولادِ علی کا چاہنے اور ان کی پیروی کرنے والا ہو۔

اب اگر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ شیعہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو علیؑ سے محبت کرے یا آپ کا دشمن نہ ہو تو پھر اس لفظ کا استعمال ہی بے موقع ہو جائے گا۔ کیونکہ صرف چاہنے یا عداوت نہ رکھنے سے ایک شخص دوسرے شخص کا شیعہ نہیں کہلایا جا سکتا، جب تک اس میں التزام کے ساتھ اقتدا، اور اتباع کی خصوصیت نہ پائی جائے، اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جسے عربی ادب کا معمولی سا ذوق رکھنے والے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

غالباً ان حقائق کے پیشِ نظر ہر معقول انسان مذکورہ احادیث پر توجہ دینے کے بعد یہی نتیجہ نکالے گا کہ لفظ شیعہ سے مقصود عام لوگ نہیں، بلکہ ایک خاص گروہ ہے۔ جو حیدرِ کرّارؑ سے خصوصی تعلق رکھتا ہے۔

مُعَاون اشارے

اور اس تصریح کے بعد شاید ہی کوئی منصف مزاج یہ نتیجہ نکالنے کی جرأت کرے کہ مندرجہ بالا احادیث اور اس مفہوم کی دوسری روایتوں میں ایک ایسی جماعت کے وجود کی نمایاں دلیلیں نہیں ہیں۔ جو مولائے متقیان سے خصوصی ارتباط کے سبب اس وقت کے تمام مسلمانوں سے جو سب کے سب آپ سے اظہارِ محبت کیا کرتے تھے، ممتاز نہ ہو گی۔

میں ذاتی طور پر اس اعتراف کے موقف میں نہیں ہوں، کہ وہ صحابہ جو یہ راہ نہیں اختیار کر سکے انھوں نے شعوری انداز میں ارشادِ رسولؐ کی خلاف ورزی کی، ممکن ہے ان میں سے بہت سوں نے یہ فرامین نہ سُنے ہوں یا جن

لوگوں نے شرفِ سماعت حاصل کیا وہ منشاءِ رسالت ہی نہ سمجھ سکے ہوں!

علاوہ ازیں سرورِ عالمؐ کے وہ ارشادات جن کے ذریعہ حضورؐ نے امیر المومنینؑ، اہلِ بیتِ اطہارؑ اور ان کے شیعوں کے مدارج و مراتب کا اعلان فرمایا ہے اگر ان کے سمجھنے میں ذرا وسعتِ نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان روایات میں صرف عمومی فضائل ہی نہیں بلکہ "دبستانِ تشیّع" کے سربراہ کی شناخت، حیثیت، صلاحیت اور اس مکتب کے قیام و حقانیت کی جانب بھی واضح اشارے کئے گئے ہیں۔ مثلاً علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسٰی سے تھی۔[1] اے علیؑ تمھارا دوست مومن ہے اور دشمن منافق۔[2] اُمت والو! میں تم میں دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت، میرے اہلِ بیتؑ۔[3] "حدیثِ طائر" پروردگار اپنے محبوب ترین

---

۱ علی منی بمنزلة هارون من موسٰی

۲ لا یحبک الا مؤمن ولا یبغضک الا منافق۔

۳ إنّی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللهِ وعترتی اهلَ بیتی۔
(استیعاب جلد ۲۔ صفحہ: ۴۷۲)

بندے کو بھیج دے۔[4] کل یہ علَم اس مرد کو دُوں گا جو خود بھی اللہ اور رسُول کا چاہنے والا ہوگا۔ اور اللہ اور رسُول بھی اس کے چاہنے والے[5] علیؑ حق کے ساتھ ہیں، اور حق علیؑ کے ساتھ[6]۔

یہ اقوال زیادہ تر صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ماخوذ ہیں، اور ایسی ہی ہزاروں صحیح السّند روایتیں موجود ہیں۔ اس مختصر سے رسالے میں اتنی گنجائش کہاں جو تفصیل کو جگہ دی جائے۔ شوقِ تحقیق رکھنے والے علامہ سیّد حامد حسین صاحب لکھنوی کی مشہور کتاب "عبقات الانوار" کا مطالعہ کرسکتے ہیں جو بلحاظِ ضخامت و افادیت صحیح بخاری سے دہ چند بڑی اور ہمارے تحقیقی مساعی کا صرف ایک شاہ کار ہے۔

رسُول ﷺ کے بعد

لیکن جب نبوّت کا چراغ بجھ گیا تو صحابہ کے ایک فریق نے یہ کوششیں شروع کردیں کہ کسی طرح خلافت

[4] اللھم ائتنی باحبّ خلقك الیك (سنن ترمذی، صفحہ ۲۱۳)

[5] لاعطینّ الرایة غداً رجلا یحبّ اللہ و رسولہ ویحبّہ اللہ و رسولہ۔ (مسند احمد بن حنبل۔ جلد ۵، صفحہ: ۳۵۳)

[6] علیٌّ مع الحقّ والحق مع علی۔

علیؑ کو نہ ملنے پائے۔ اس مخالفت کا سبب خواہ آپ کی صغر سنی ہو، یا خاندانِ قریش کا یہ جذبہ رشک کہ نبوّت و امامت بنو ہاشم کے گھر میں نہ جمع ہونے پائے یا کچھ اور اسباب ہوں، جن کے تذکرے کا یہ موقع نہیں!

لیکن باتفاقِ فریقین جب مُسلمانوں سے بیعت لی جارہی تھی، اُس وقت علیؑ نے ابوبکر کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا۔ اور بقول فاضلِ بخاری (صحیح باب غزوۂ خیبر) آپ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ نبیؐ کے بڑے بڑے صحابی جیسے زبیر، عمّار، مقداد وغیرہ نے بھی بیعت سے انکار کردیا۔

یہ واقعہ ہے کہ تقریباً ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ علیؑ کو نہ ریاست کی ہوس ہے، اور نہ سلطنت کی تمنّا۔

"ذوقار" میں ابنِ عبّاس سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ فرزندِ ابوطالبؑ کس جادہ پر گامزن تھا۔ امیرالمومنینؑ کے پیشِ نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ دین سلامت رہے، حق کا سکہ چلے اور باطل فنا ہوجائے۔

صاحبِ ذوالفقار ان ہی بلند احساسات کے زیرِ اثر محض احتجاج پر اکتفا کرتے ہیں اور مسندِ خلافت کو اُلٹنے کی کوئی تدبیر نہیں اختیار فرماتے بلکہ مصالحِ رشد وہدایت کے پیشِ نگاہ بقائے اسلام اور نشرِ احکام کے سلسلہ میں ہمیشہ حکومتِ وقت کو اپنے زریں مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔ اور اگر علیؑ یہ مسلک اختیار نہ فرماتے تو نہ صرف اسلامی وحدت کا شیرازہ منتشر ہو جاتا بلکہ عوام پھر جاہلیت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے۔

شیعہ بھی اپنے امیر کی روش پر چلتے رہے۔ تقاضائے وقت ہی یہ تھا کہ تفریق سے کام نہ لیا جائے، اسی بناء پر خلفائے ثلاثہ کے دور میں اس فرقہ نے بحیثیتِ فرقہ اُبھرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ دوستانِ علیؑ ہر حکمران کے طریقِ کار اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا خاموش مطالعہ کرتے رہے یہاں تک کہ قوم نے خود ہی علیؑ کو منتخب کر لیا امیر المومنینؑ تختِ امارت پر متمکن ہوئے لیکن امیر معاویہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے، اور انھوں نے صفین میں اپنی فوجیں بھر دیں!

نشر و اشاعت

صحابہ کی ایک جماعت تو پہلے ہی سے نفسِ رسولؐ کے ساتھ تھی۔ یہ شورش دیکھ کر بقیۃ اصحاب نے بھی آپ کی معیت اختیار کر لی۔ عمار یاسر، خزیمہ ذوالشہادتین اور ابوایوب انصاری جیسے اسّی (۸۰) سر برآوردہ صحابی جو تقریباً سب کے سب بدری اور عقبی تھے، ابوترابؑ کی جماعت میں شامل ہو گئے اور ان میں سے اکثر نے اپنی جانیں امامؑ پر نثار کر دیں۔

بہرحال لڑائیاں ہوتی رہیں اور ساتھ ہی معاویہ کی ریشہ دوانیاں بھی بڑھتی گئیں: نتیجۃً علیؑ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ حاکمِ دمشق نے اطمینان کی سانس لی، مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ معاویہ کے شاہی ایوانوں سے اسلام رخصت اور قیصر و کسریٰ کی روایتیں پروان چڑھنے لگیں ایک طرف علیؑ کا مقدس طریقِ حیات، زاہدانہ اطوار، اعلیٰ کردار اور اس کے مقابل معاویہ کے بگڑے ہوئے رنگ ڈھنگ

عمرو عاص اور ـــ "مصر کی تولیت!"

یزید اور ـــ "حادثہ استخلاف!"

زیاد اور ـــ "واقعۂ استلحاق!"

یہ ایسے غیر آئینی امور تھے جن سے "معاویائی ذہنیت" بری طرح
آشکار ہو چکی تھی۔ پھر عیش و عشرت کے بڑھتے ہوئے طوفان نے
تو گوشہ گوشہ نمایاں کر دیا ——— اللہ اللہ! کہاں اسلام کا بتایا ہوا
سیدھا سادہ آئینِ زندگی ——— اور کہاں فرزندِ ابوسفیان
کا باز نطینی طمطراق۔

امیر معاویہ کے شاہانہ ارمان مسلمانوں کی گاڑھی کمائی
سے پورے ہو رہے تھے۔ اُموی راج محل کا "سب رس" یعنی
وہ پُر تکلف دسترخوان جو آج بھی "ضرب المثل" ہے۔ شاہِ جم جاہ
کی لذّت پرستی کا چُنا ہوا ثبوت تھا۔

وزیر ابوسعید منصور ابن حسین آبی متوفی ۴۲۲ھ نے
اپنی تالیف "نثر الدرر" میں ایک واقعہ لکھا ہے، موصوف
تحریر فرماتے ہیں:

"احنف ابنِ قیس کہا کرتے تھے کہ ایک دفعہ
میں امیر معاویہ کے پاس گیا تو انھوں نے
میرے آگے انواع و اقسام کی اتنی غذائیں
رکھ دیں جن کا شمار مشکل تھا۔ میں دیکھ دیکھ کر
حیران تھا کہ کھاتے کھاتے انھوں نے "خاصے" کی
ایک چیز میری طرف بڑھائی جسے میں پہچان نہ سکا

دریافت کیا یہ کیا ہے؟ جواب ملا "یہ بھیجا بھری
بطخ کی آنتیں ہیں، پہلے انھیں پستے کے تیل میں
تل لیا گیا، اور پھر اُوپر سے مختلف مصالحے چھڑک
دیئے گئے" احنف کا بیان ہے کہ میں یہ سُن کر
رونے لگا۔ معاویہ نے پوچھا۔ روتے کیوں ہو۔؟
میں نے جواب دیا، اِس وقت مجھے علیؑ یاد
آگئے۔ ایک دن کی بات ہے۔ خدمتِ اقدس
میں حاضر تھا، افطار کا وقت آگیا۔ حضرتؑ نے
ٹھہرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں ایک سر بمہر تھیلی
لائی گئی۔ میں نے سوال کیا۔ حضورؑ اِس میں کیا
ہے؟ ارشاد ہوا، جَو کے ستّو! ——— عرض کی،
امیر المومنینؑ! چوری کا اندیشہ تھا یا شدّتِ اقتصاد
کے باعث تھیلی پر مہر لگائی ہے؟ فرمایا۔ اِن میں
سے کوئی وجہ نہیں۔ اس احتیاط کا سبب صرف
یہ خیال ہے کہ کہیں میرے فرزند حسنؑ و حسینؑ
ان ستّوؤں میں گھی یا روغنِ زیتون نہ ملا دیں"
میں نے پھر استفسار کیا "مولا! کیا گھی یا روغنِ
زیتون کا استعمال ناجائز ہے؟ ارشاد ہوا،

ناجائز تو نہیں لیکن آئمۂ حق کے لئے ضروری ہے
کہ وہ خستہ حال عوام کی صفوں سے وابستہ رہیں
تاکہ عسرت و افلاس اس فلاکت زدہ طبقے کو
باغی نہ بنادے۔ معاویہ نے کہا: احنف! تم نے
اس وقت ایسے شخص کی یاد تازہ کردی جس کے
فضائل کا انکار مشکل ہے!"

زمخشری کی "ربیع الابرار" وغیرہ میں ایسے اور بھی واقعات موجود ہیں۔

ہاں! امیر معاویہ کے فسادِ نفس کو صرف انہی بے ضابطگیوں سے بھلا کہاں قرار مل سکتا تھا، بداعمالیوں کے منتہیٰ تک پہنچنے کی آرزو دل میں چٹکیاں لے رہی تھی، چنانچہ انھوں نے امام حسنؑ علیہ السلام سے جتنے عہد و پیمان کیئے تھے، سب کی خلاف ورزی کی، اور بالآخر رسولؐ کے لختِ جگر کو زہر دلوادیا۔ اس روش اور ان حادثات کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اسلامی حلقوں میں "شام" کی سیاست کو نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا، اور کم از کم اربابِ دیانت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ امیر معاویہ قطعی طور پر صرف ایک دُنیا دار آدمی ہیں!

بلکہ وہ خود اس حقیقت کے معترف تھے۔ فاضل زمخشری کی "ربیع الابرار" میں تاجدارِ دمشق کا یہ قول اَب بھی موجود ہے کہ:

"ابوبکر نے دُنیا سے بچنا چاہا، اور دُنیا ان سے
بچتی رہی۔ عمر نے دُنیا کو آزمایا، اور دُنیا
نے ان کی آزمائش کی ___ رہے عثمان تو
انھوں نے دُنیا پر خوب قبضہ جمایا، مگر دُنیا بھی
ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئی۔ اور میں تو ہے
فرشِ راحت بنانے کے لئے قدم قدم پر جان
بچھاتا رہا ___ پایانِ کار میں دُنیا کا ہو گیا
اور دُنیا میری ہو گئی"۔

مختصر یہ کہ ایک طرف تو لوگوں کے رجحانات بدل رہے تھے اور دُوسری جانب پیغمبرؐ کے موجود الوقت صحابی جمہورِ اسلام کو علیؑ اور اولادِ علیؑ کے ان فضائل سے واقف کرا رہے تھے، جو انھوں نے رسولؐ کی زبانِ فیض ترجمان سے سُنے تھے۔ اُن خصوصیات کا انکشاف کر رہے تھے جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

وہ منظر کسے یاد نہ ہوگا، کہ حبیبِ خدا اپنے چہیتے

نواسوں کو پشتِ مبارک پر بٹھائے ہوئے ہیں ـــــ اور فرماتے جا رہے ہیں :

" کیا کہنا تمھاری سواری کا، بہترین سواری ہے، اور کیا کہنا تمھارا، بہترین سوار ہو"

نیز قالبِ وحی میں ڈھلے ہوئے یہ الفاظ کہ :

" حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں"

کیا رہ کر اپنی اپنی اشاعت کا تقاضا نہ کرتے ہوں گے؟ حقیقتیں پھیلنے کا حق رکھتی ہیں، ـــــ اور احساسِ حق رکھنے والے انھیں پھیلانے کے آرزومند تھے۔

اِس صورتِ حال کا یہ اثر ہوا کہ عام کلمہ گو تشیع کی جانب مائل ہونے لگے، اور اس فرقے کے لئے ترقی کی راہیں کھل گئیں۔

سب سے بڑا سبب

لیکن درحقیقت شیعیت کے فروغ کا سب سے بڑا سبب وہ خونچکاں واقعہ ہے جس نے اسلامی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ ۶۱ھ کا یہ دردناک سانحہ جسے المیۂ کربلا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اپنی نوعیت کے

لحاظ سے تشیع کی نشر و اشاعت میں بہت موثر ثابت ہوا۔ شہادتِ حسینؑ کے اثرات نے عمومیت اختیار کر لی۔ زید ابن ارقم، جابر ابن عبداللہ انصاری سہل ابن سعد ساعدی اور انس ابن مالک جیسے صحابہ بھی زندہ تھے، فرطِ درد سے تڑپ اُٹھے، اور بتقاضائے فرض و محبت، فضائلِ اہلِ بیتؑ کی تشہیر میں انھوں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ اموی جفاؤں نے ان کا پیچھا کیا، اور یہ بقیۃ الصحابہ بھی سیف و ستم کا شکار ہو گئے۔ لیکن ؎

" آہِ مظلوم اثر رکھتی ہے!"

یہ واقعات ایسے نہیں تھے کہ قوم ان پر غور نہ کرتی، غور کیا اور اچھی طرح، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ لوگ جوق در جوق علیؑ اور اولادِ علیؑ کا دم بھرنے لگے، نیز شیعوں کی عددی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا جس سرعت سے بنو امیہ کا ظلم بڑھ رہا تھا، اسی رفتار سے عام قلوب میں اہلِ بیتؑ کی محبت جاگزیں ہوتی جا رہی تھی، آلِ امیہ نے بہت ستایا، جی بھر کے ستم ڈھائے لیکن ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اموی مظالم کا بھی ردِ عمل ہوا، اور بڑی شدت سے!

شعبی اپنے لڑکے سے کہتے ہیں:

"بیٹا! دین نے جن قدروں کو بلند کیا، دُنیا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ مگر دُنیا نے جن چیزوں کو بنایا سنوارا، انھیں دین نے مٹا کر رکھ دیا، علیؑ اور اولادِ علیؑ ہی کے حالات پر غور کرلو۔ امیّہ زادوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ ان کی فضیلتوں پر پردے ڈالے، حقیقتوں کو چھپانے کی کوشش کی اور اپنے اسلاف کے گُن گانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، مگر اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں" یعنی آلِ امیّہ کی آبرو مٹی میں مل گئی، اور آلِ محمدؐ کا نام روشن سے روشن تر ہوتا چلا گیا!"

شعبی باوجودیکہ علیؑ کے دشمن کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے، مگر یہ کلمۂ حق ان کی زبان سے نکلا، اور تاریخوں میں محفوظ ہو گیا۔

مزید اسباب

زمخشری نے "ربیع الابرار" میں شعبی کا یہ بیان بھی درج کیا ہے:

"عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ علیؑ سے محبت کرتے تو، قتل کا اندیشہ تھا، اور عداوت باندھتے تو ہلاکت کا یقین!"

الغرض مصائب و آلام کا تانتا بندھا رہا۔ یہاں تک کہ سفیانی تخت مروانی حاکم عبد الملک کے قبضے میں چلا گیا۔ معلوم ہے یہ عبد الملک کون تھا؟ اُف! وہ شقی جس کے حکم سے حجّاج نے خانۂ کعبہ کو ڈھا کر اس میں آگ لگائی۔ جوارِ حرم میں رہنے والوں کو بے جھجک تہ تیغ کیا۔ عبد اللہ ابنِ زبیر کو مسجد الحرام میں قتل کر کے اس مقدس زمین کی حرمت کو خاک میں ملایا۔ اپنے چچا زاد بھائی سعید ابنِ اشدق سے عہد و پیمان کر کے اس کی جان لے لی۔

سچ کہنا کلمہ گویو! ایسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والے کو مسلمان بھی کہا جا سکتا ہے؟ چہ جائیکہ خلیفۃ المسلمین؟

الحاصل آلِ مروان کی پوری حکومت اسی ڈھچر پر چلتی رہی اور عمر ابنِ عبد العزیز کے علاوہ سب کے یہی نقشے رہے۔ اس کے

بعد بنو العباس کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے دور نے تو ماضی کے عصرِ ستم کو بھی مات دے دی۔

اُس وقت کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

یا لیت جور بنی مروان دام لنا
ولیت عدل بنی العباس فی النّار

"کاش! ہم ہمیشہ آلِ مروان کی جفائیں سہتے رہتے۔
اور کاش! ان عباسیوں کا عدل و انصاف جہنّم
واصل ہو جاتا۔"

کِس بیدردی سے سادات کا خون بہایا گیا، کِن کِن طریقوں سے انھیں ملیامیٹ کرنے کی کوششیں کی گئیں؟ اس وقت کا ادب دیکھنے سے وہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ شعراء نے مختلف پہلوؤں سے ان کے مظالم کو بے نقاب کیا ہے۔ عہدِ متوکّل کے ایک سخنور نے کتنی سچّی تصویر کھینچی ہے۔ کہتا ہے ؎

تاللہ ان کانت امیة قد اتت	قتل ابن بنت نبیّها مظلوما
فلقد اتته بنو ابیه بمثله	هذا لعمرك قبره مهدوما
اسفوا علی ان لا یکونوا شار	کوا فی قتله فتتبعوه رمیما

"خدا گواہ ہے، اگر آلِ امیہ نے رسولؐ کے نواسے کو ظلم سے شہید کر ڈالا تو یہ عباسی جو اپنے تئیں عمِ رسولؐ کی اولاد کہتے ہیں، کسی طرح بھی ستم آرائی میں اُموی خاندان سے پیچھے نہیں رہے۔ دیکھو نا! اِن جفاکاروں نے تو مظلوم کی قبر تک منہدم کر ڈالی۔"

"ہاں ہاں! بنی عباس پچھتاتے ہیں، دستِ تاسّف مَلتے ہیں کہ انھوں نے بنو امیہ کے دوش بدوش حُسینؑ کا خونِ ناحق بہانے میں کیوں حصّہ نہ لیا، اور اب مظلوم کی لحد مسمار کر کے تلافیِ مافات کی کوشش کی ہے۔"

بنو اُمیہ۔ آلِ مروان اور سلاطینِ عباسیہ کی سیرت کے یہ چند نمونے تھے۔ اب اگر اس کے مقابل آپ علیؑ اور اولادِ علیؑ کی پاکیزہ زندگی پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ شیعیت کیوں پھیلی؟ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ تشیّع ایرانیوں کی جدت طرازی اور سبائیوں کی کرشمہ سازی ہے یا اسلام اور محمدؐ کا بتایا ہوا سیدھا سادہ راستہ ہے۔

فرزندانِ علی علیہم السلام

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد علوی خاندان کے سربراہ امام زین العابدین علیہ السلام ہوئے۔ دُنیا جانتی ہے کہ واقعۂ کربلا کے اثر سے آپ بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ زندگی کا بیشتر وقت یا تو عبادتِ الٰہی میں گزرتا، یا تربیتِ اخلاق اور تہذیبِ نفس کا درس دیتے رہتے تھے۔

حسن بصری، طاؤس یمانی، ابنِ سیرین اور عمرو ابن عبید جیسے مشہور زاہد و عارف اسی مکتب کے فیض یافتہ ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ سیدِ سجادؑ کی اخلاقی درس گاہ سے مسلمانوں کو بروقت اور زبردست مدد ملی، کیوں کہ اَبنائے زمانہ حق اور حقیقت کے رستوں سے کوسوں دُور پڑ گئے تھے!

عہدِ زرّیں

صادق آلِ محمدؑ کا زمانہ نسبتاً موافق تھا۔ کیونکہ اُموی اور عباسی حکمران تھک چکے تھے۔ حکومتوں میں

اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ علانیہ ظلم و ستم کے مواقع ذرا کم ہو گئے تھے۔ بنابریں دبی ہوئی صداقتیں، اور چھپی ہوئی حقیقتیں سورج کی طرح اُبھریں اور روشنی کی طرح پھیل گئیں خوف و خطر کے باعث جو لوگ تقیہ میں تھے، وہ بھی کھل گئے، فضا موافق تھی اور راہیں ہموار۔ امامؑ عالی مقام نے تبلیغ و تلقین میں رات اور دن ایک کر دیئے ہاں! تبلیغ و تلقین کا وہ سلسلہ جس کا تعلق محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعلیمات سے تھا، قائم فرمایا درسِ حق عام ہوا، اور لوگ کثرت سے مذہبِ جعفری قبول کرنے لگے۔ اس عہد کو تشیّع کی نشر و اشاعت کا زرّیں دَور کہا جاتا ہے۔ کیونکہ قبل ازیں عام مسلمان اس افراط سے اور کھلم کھلا شیعیت کی جانب رجوع نہیں ہوئے تھے۔

دریائے فیض جاری تھا، تشنگانِ معرفت خود بھی سیراب ہوتے تھے اور دوسروں کی بھی پیاس بجھاتے تھے۔ بقول ابوالحسن وشاء:

"میں نے اپنی آنکھوں سے مسجدِ کوفہ میں چار ہزار علماء کا مجمع دیکھا ہے اور سب کو یہ کہتے سنا ہے کہ حدّثنی جعفر ابن محمدؑ"

یعنی یہ روایت مجھ سے جعفر صادق علیہ السّلام
نے بیان فرمائی ہے"

بہرکیف بنو امیّہ اور بنو العبّاس کی بے پناہ جاہ طلبی، طوفانی تشدّد، حد سے گذری ہوئی دُنیا پرستی پھر غیر محدود رنگ رلیاں اور اس کے برعکس فرزندانِ علیؑ کی علم دوستی عبادت گزاری، حق پسندی اور غلط سیاست سے احتراز یہ ایسے صریح اور قوی عوامل تھے جو تشیّع کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔

دیکھئے! یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ دُنیا والے جی بھر کر دُنیا پر جان چھڑکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دلوں میں علوم و معارف اور امورِ دین کی عظمت کا احساس ہوتا ہے، اور ہم جس زمانے کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ تو عہدِ رسالتؐ سے قریب بھی تھا۔ نیز مُسلمانوں کے دل و دماغ ان تاثّرات سے مملو تھے کہ اسلامی نظامِ زندگی بے شمار برکتوں کا حامل ہے۔ قرآنی تعلیم سے انھیں وہ فیوض حاصل ہوئے جن کا تصوّر بھی قبل ازیں ان کیلئے محال تھا۔ قیصر و کسریٰ کو اسلام ہی نے فتح کیا۔ اسلام ہی کے نام پر وہ شرق و غرب عالم کے مالک بنے۔ علاوہ اس کے

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اِس مذہب میں کافی حد تک وسعتِ نظر موجود ہے۔ طریقے جائز ہوں تو یہ دُنیوی مال و متاع حاصل کرنے سے بھی کسی کو نہیں روکتا۔ یہ دین کیا ہے سراپا رحمت ہے!

غرضیکہ یہ قلبی احساسات چھپے ہوئے ٹھوکے تھے جو عوام کو علومِ دین کی جانب متوجہ کرتے رہے۔

رغبتِ کامل نہ سہی لیکن قدرے شوق ضرور اُبھرا ہوگا کچھ چاہتے ہونگے کہ ہم اپنی حیاتِ اجتماعی کو احکامِ شریعت کی روشنی میں سنوار لیں۔ بعضوں کی یہ تمنّا ہوگی کہ ہمارا معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگ جائے اور کسی کو یہ ارمان ہوگا کہ کم از کم ہماری گھریلو زندگی ہی صحیح قوانین کے مطابق ہو جائے۔ مگر یہ معارف حاصل کہاں سے کرتے؟ ان کجکلاہوں کے دربار سے جو خلیفۃ المسلمین کے تمغے لگائے ہوئے تھے اور بس؟ لیکن وہاں تو ان قدروں کا گذر بھی نہ تھا!

پھر کدھر جاتے؟ ہاں! جنھوں نے ڈھونڈھا انھوں نے پایا، اور ان کی مُراد پُوری ہُوئی۔ آلِ محمدؐ قرآن کا مخزن اور دانش و آگہی کا معدن تھے۔ ان ہی خوبیوں کے باعث عوامی ذہن پر نہ صرف ان کی برتری کے نقوش ثبت ہو گئے۔ بلکہ یہ

عقیدہ بھی مسلمانوں کے دِلنشیں ہوتا چلا گیا کہ رسُولِ مقبولؐ کے سچّے وارث یہی ہیں ——— اور امامت ان ہی کا حق ہے۔

خلوصِ کامل ———

پھر یہ عقیدہ اِس درجہ مستحکم ہوتا گیا کہ اِس جماعت میں شریک ہونے والے دُنیا کے ہر خطرے کو ہیچ سمجھنے لگے۔ اکثر شیعہ تو عملی طور پر اتنے جری، جاں باز اور احساسِ فدویت سے سرشار نظر آتے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں مثلاً حجر ابنِ عدی کندی، عمرو ابن حمق خزاعی، رشید ہجری، میثم تمّار اور عبداللہ ابنِ عفیف ازدی وغیرہم یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مختلف مواقع پر باطل پرستوں سے باقاعدہ ٹکر لی۔ اچھا خاصہ مقابلہ کیا۔ اگرچہ کہ مخالف عنصر مادّی اعتبار سے کافی مضبوط تھا مگر ان کی اخلاقی قوّت نے، وہ کر دکھایا جو بڑے سے بڑے لشکر سے بھی نہ ہو سکتا۔ یعنی ان کی قربانیوں سے ایک طرف تو قصرِ ستم میں زلزلہ آگیا، اور دُوسری جانب عوامی ذہن و فکر کے رُخ بدل گئے!

اب کوئی بتائے کہ یہ سرفروش کیوں اس طرح موت سے

کھیلتے رہے؟ آلِ محمدؐ سے کسی دُنیاوی فائدے کی اُمید تھی؟ یا جان و مال کا خوف لاحق تھا؟ ——— تاریخ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دے گی۔ کیونکہ فرزندانِ مرتضیٰ تو مادّی وسائل کے اعتبار سے خود ہی بے چارگی کے عالم میں تھے لہٰذا کیا دیتے اور کیا لیتے؟ کچھ نہیں، ایمان کی بات تو یہ کہ ان مجاہدوں کے نورانی دل، یقینِ محکم اور خلوصِ کامل کے پاکیزہ جذبوں سے معمور تھے، اور یہی جذبے وقت پر بھرے دریا کی طرح اُمنڈنے لگتے تھے ——— علاوہ ازیں پہلی صدی اور دوسری صدی ہجری کے ادبا پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُمید و بیم کے باوجود شعرائے وقت، شاہانِ عصر اور ان کی بے راہ روی سے بے زاری کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور اہلِ بیتِ مصطفویؐ کی تعریف میں رطب اللسان ھیں۔

حالانکہ شاعر اپنے بنتے بگڑتے کو زیادہ دیکھتا ہے مگر بایں ہمہ اس کے افکار خلفائے زمانہ کے خلاف اور آئمۂ حق کے موافق ظاہر ہوتے ہیں۔ فرزدق، کمیت، سید حمیری، دعبل، دیک الجن اور ابو تمام بحتری سے لے کر ابو فراس حمدانی تک غور کرتے چلے آئیے، سب کے سب عترتِ طاہرہ

قصیدے کے شعر کا ترجمہ حاشیہ میں دیکھیں

کی مدح وثنا میں ڈوبے ہوئے ملیں گے۔ ابو فراس کے مقبول عام قصیدے کا یہ شعر ؂

الدّین مختومٌ والحق مهتضمٌ
وفیٔ آل رسول اللّٰه مقتسمٌ[1]

زبانِ حال سے واضح کر رہا ہے کہ اس عہد کے ادیبوں پر کیا اثر تھا۔

دعبل کہتے ہیں کہ ”چالیس برس سے میں اپنی موت کا سامان (تختۂ دار) لئے پھر رہا ہوں، مگر ابھی تک کسی نے قاتل بننا منظور نہیں کیا۔“

دعبل نے رشید، امین، مامون اور معتصم کی خوب خوب ہجو کی، اور اس کے برعکس امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم اور امام رضا علیہم السّلام کی شان میں بڑے بڑے قصیدے نظم کئے۔ جو کافی مشہور ہیں۔

آخر یہ تمام کے تمام بے سبب اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے تھے؟ بے مقصد اپنے عیش و آرام کو مٹی میں ملا رہے تھے؟ کوئی تو وجہ ہوگی؟

[1] دین ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، حق نشانۂ ستم بن گیا۔ اور آلِ رسولؐ کا حصّہ آپس میں بانٹ لیا گیا۔

جب ہم اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہیں تو آثار اس کے سوا اور کچھ نہیں بتاتے کہ یہ آلِ رسولؐ کی صداقت تھی جو سوچنے سمجھنے والے دماغوں کو سربفلک زرّیں ایوانوں سے متنفرّ اور آیۂ مودّت کی جانب مائل کرتی جا رہی تھی۔

یہ سلسلہ اور آگے بڑھ سکتا ہے مگر ایضاحِ مطلب کے لئے مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ بس! اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ تشیّع کی ابتداء اور ارتقاء کے متعلق چند حقائق معلوم ہو جائیں اور غالباً اس ضمن میں کوئی بات مبہم نہیں رہی ہوگی۔ ایک سچّی روداد تھی جسے نہایت اختصار کے ساتھ ہم نے پیش کر دیا، اور پھر اعادہ کئے دیتے ہیں کہ شیعیّت کا آغاز خود نبی کریمؐ کے ہاتھوں ہوا، اور اس کی نشر و اشاعت حالات و واقعات کا ایک زنجیرہ ہے۔ جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے مربوط اور اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے۔ جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے متصل ہے ؛

نظری اور عملی مسائل!

قبل اِس کے کہ ہم اصُول و فروع کو جُدا جُدا مباحث میں بیان کریں، مجموعی طور پر تمام مسائل کو عمُومی اعتقاد کے مطابق پانچ کلّیات پر منقسم کرتے ہیں :

(۱) خالق کی معرفت۔

(۲) اس کے مبلّغ کی شناخت۔

(۳) مسائلِ عبادت اور طریقِ عمل کی پہچان۔

(۴) نیکیوں کا حصُول اور بُرائیوں سے اجتناب۔

(۵) معاد اور سزا و جزا کا اعتقاد۔

اس لحاظ سے دین کے دو شعبے ہوئے "نظری" اور "عملی" عام اعتبار سے "اسلام و ایمان" مرادف ہیں۔

توحید، نبوت اور معاد اسلام کے تین بنیادی رکن ہیں، اگر کوئی شخص ان ارکان میں سے کسی رکن کا منکر ہو، تو نہ وہ مسلم ہے نہ مومن، اور اگر ان ارکان پر ایمان لے آئے تو اس کا شمار مسلمانوں میں ہوگا۔ اور اسے مسلمانوں کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔ لیکن حسب تصریح "الایمان اعتقاد بالجنان و اقرار باللسان و عمل بالارکان"[۱] لفظ ایمان سے ایک خاص مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مزید ایک رکن کا اضافہ۔ یعنی ان فرائض کی تعمیل جن پر اسلامی نظام کا دار و مدار ہے۔ ان فرائض کی پانچ قسمیں ہیں:

☆ نماز ☆ روزہ ☆ زکوٰۃ ☆ حج ☆ جہاد

"اسلام و ایمان" کے سلسلہ میں ہم نے عام و خاص کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام و ایمان کی دو قسمیں ہیں:

اسلام و ایمان عام اور اسلام و ایمان خاص۔ یہ تقسیم پروردگار عالم کی اس ہدایت پر مبنی ہے:

[۱] قلبی اعتقاد، زبانی اقرار اور ارکان پر عمل کرنے کا نام ہے ایمان۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

(اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ میرے رسول! انھیں سمجھا دو کہ تم جسے ایمان کہہ رہے ہو وہ ایمان نہیں، اسلام ہے ایمان کا تو تمھارے دلوں میں گزر بھی نہیں ہوا)

سورۃ الحجرات۔ آیت: ۱۴

مزید توضیح کے لئے دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

(حقیقتاً ایمان دار تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس کے بعد کبھی انھوں نے اس میں کوئی شک نہیں کیا نیز اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے رہے، وہی سچے مومن ہیں)۔

سورۃ الحجرات۔ آیت: ۱۵

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل قول، یقین اور عمل کے مجموعے کا نام ہے ایمان! بہرحال یہ تو تھا تمام مسلمانوں کے اساسی نظریات کا خلاصہ، مگر! شیعہ ان ارکان کے

ساتھ ایک اور رکن کو جزوِ ایمان قرار دیتے ہیں، یہ بنیادی مسئلہ عقیدۂ امامت ہے۔

منصبِ الٰہی

شیعی نقطۂ نظر کے مطابق امامت، نبوّت کی طرح "منصبِ الٰہی" ہے۔ جس طرح خداوندِ عالم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نبوّت و رسالت کے جلیل القدر عہدہ کے لئے منتخب کرتا ہے اسی طرح امامت کے معاملے میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ خود ربّ العزّت نبیؐ کو حکم دیتا ہے کہ وہ "شخصِ منتخب" کی امامت کا اعلان کردے۔ پیغمبر حسب الحکم فرائضِ شریعت کی تکمیل کے لئے نصّ کے ذریعے اس چُنی ہُوئی ہستی کو خلق کا پیشوا بنا دیتا ہے۔ نبیؐ اور امامؑ میں فرق صرف یہ ہے کہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام خصوصی توفیق کے ساتھ رسولؐ سے احکام حاصل کرتا ہے۔

پس رسولؐ خدا کا پیام رساں ہے، اور امام رسولؐ کا پیام بر!

انحصار

امامت بارہ [۱۲] ذواتِ مقدسہ میں منحصر ہے ہر امامؑ نے ہونے والے امام کو نصّ کے ذریعے مقرر کیا۔

عصمت

انبیاء کی طرح آئمہؑ بھی معصوم ہوتے ہیں تاکہ امکانِ خطاء باقی نہ رہے۔ فرمانِ خداوندی قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ [1]
"عصمتِ امام" کی روشن دلیل ہے۔

فضیلت

علاوہ ازیں امامؑ تمام علوم و صفات کے لحاظ سے سارے زمانے پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مقصدِ امامت ہی یہ ہے کہ انسانی دُنیا کو منزلِ کمال تک پہنچایا جائے اور نفوسِ بشری کو علم و عملِ صالح سے سنوارا جائے۔

نبوّت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ

[1] "اس نے کہا۔ میں تم کو خلق کا امام بنانے والا ہوں۔" (ابراہیمؑ نے) عرض کی، اور میری اولاد میں سے، ارشاد ہوا۔ میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی نہیں فائز ہو سکتا۔" (بقرہ۔ آیت: ۱۲۴)

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ[1]

اس کا انطباق امامؑ پر بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ کوئی ناقص کسی کو کامل نہیں بنا سکتا۔ جو خود کچھ نہ رکھتا ہو— وہ دُوسروں کو کیا دے گا؟ ؎

آں خویشتن گم است کرا رہبری کند؟

لہٰذا امامؑ کمالات کے اعتبار سے نبیؐ سے قدرے کم، اور بشر سے بہت بلند ہوتا ہے۔

مومن و مسلم

چنانچہ مذکورہ مفہوم کے مطابق اگر کوئی شخص امامت کا قائل ہو تو وہ شیعی روایات کے لحاظ سے خاص معنوں میں مومن کہلاتا ہے، اور اگر صرف ان ہی ارکان کا اقرار کرے جو عام مُسلمانوں کا مرکزِ اعتقاد ہیں تو اسے عام معنوں میں "مُسلم و مومن" کہیں گے، اور جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام احکامِ اسلام اس پر مرتب ہوں گے، اس کی جان، مال اور عزت و آبرو وغیرہ کا احترام فرض ہے۔

---

[1] وہی تو ہے جس نے امیّوں میں ان ہی کا ایک رسُول بھیجا، جو انھیں اس کی آیات سُناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے؟ (سورۂ جمعہ: آیت ۲)

صرف امامت کا اقرار نہ کرنے سے کوئی فرد اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ البتہ قیامت کے دن معلوم ہوگا، اور قرب و کرامت کی منزلوں میں یہ عقیدہ اپنا اثر دکھائے گا۔

دُنیا میں تمام مُسلمان یکساں اور ایک دُوسرے کے کفو ہیں۔ ہاں آخرت میں ضرور درجوں کا تفاوت ہوگا۔ عمل اور نیّت کے اعتبار سے مقامات ملیں گے۔ خیر! آخری فیصلہ تو خُدا کے ہاتھ ہے، ہم ان بحثوں میں کیوں پڑیں؟

امامیہ

اچھا! تو ابھی یہ وضاحت کی جا رہی تھی کہ عام مُسلمانوں میں شیعوں کو جو امتیازی حیثیت حاصل ہے وہ اِس وجہ سے کہ یہ آئمہ اثنا عشر کی امامت کے معتقد ہیں اور اسی بناء پر اس فرقہ کو امامیہ کہتے ہیں۔

اِس کا خیال رہے کہ تمام شیعہ "امامیہ" نہیں ہیں۔ کیونکہ لفظ شیعہ کا اطلاق زیدیہ، اسماعیلیہ، واقفیہ اور فطحیہ وغیرہم پر بھی ہوتا ہے اور یہ تو وہ فرقے ہیں جو مُسلمانوں میں شامل ہیں۔ لیکن اگر ہم دامنِ نظر کو ذرا اور پھیلا دیں تو بہت سے ایسے فرقے بھی ملیں گے جو دائرۂ اسلام سے قطعاً

خارج ہیں مگر پھر بھی شیعہ کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خطابیہ وغیرہ اور اس طرح سو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ فرقوں کی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں شیعہ کا نام امامیہ فرقے سے ہی مختص ہو چکا ہے، جو سنیوں کے بعد عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مکتبِ فقہ ہے۔

آئمۂ اثنا عشر

اسلامیات میں آئمۂ اثنا عشر کا عقیدہ کچھ نیا نہیں، مسلمانوں کی جملہ معتبر و مستند کتابوں میں یہ ذکرِ خیر موجود ہے۔ امام مسلم و بخاری نے اپنے "صحاح" میں متعدد طریقوں سے حدیث "اثنیٰ عشر" کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

(۱) جابر ابنِ سمرہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ پیغمبرِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "یہ نظام اُس وقت تک ختم ہونے والا نہیں جب تک کہ بارہ خلیفہ نہ گذر جائیں" ——— اس کے بعد حضورؐ نے آہستہ سے کچھ فرمایا، جو میں سُن نہیں سکا۔ اپنے باپ سے دریافت کیا کہ اس کے آگے سرکارِ رسالتؐ نے کیا ارشاد فرمایا؟ جواب

ملا۔ نبی کریمؐ کا فرمان ہے کہ "یہ سب قریش سے ہوں گے؟"

(۲) دوسری روایت ہے کہ "جب تک بارہ مقتدر رہیں گے یہ معاشرہ یونہی برقرار رہے گا۔"

(۳) تیسری حدیث، "جب تک بارہ خلفاء ہیں اسلام کی شان و شوکت باقی رہے گی۔" [۱]

اب خدا جانے یہ بارہ خلیفہ کون ہیں؟ سوادِ اعظم میں تو رسالت مآبؐ کا یہ قول مشہور ہے کہ: "میرے بعد خلافت تیس[۳۰] برس رہے گی۔ پھر حرص و آز اور مکر و فریب کی آماجگاہ بن جائے گی۔"

یہاں ہمیں بحث و استدلال سے مطلب نہیں، صرف عقائد سے غرض ہے اگر کوئی آئمۂ اثنا عشر کی امامت کا تفصیلی ثبوت چاہتا ہے، تو ہماری ان ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے جو "علمِ کلام" میں آپ اپنی نظیر ہیں:

---

[۱] محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے اپنی "صحیح" کی چوتھی جلد باب الاستخلاف من کتاب الاحکام کے صفحہ ۱۶۴ پر، اور مسلم بن حجاج القشیری نے اپنی "صحیح" کی دوسری جلد، کتاب الامارہ کے صفحہ ۱۱۹ پر اِن حدیثوں کی تفصیل دی ہے: (نجفی)

شیعی نقطۂ نظر سے مذہب دو شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ عِلم اور عمَل۔ یعنی کچھ مسئلوں کا تعلق عقل سے ہے، اور کچھ مسائل جسم سے متعلق ہیں۔ وہ مسئلے جن کا علاقہ علم یعنی عقل سے ہے انھیں "اصُولِ دین" سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان کی تعداد پانچ ہے: (۱) توحید (۲) نبوّت (۳) امامت (۴) عدل (۵) معاد ؛

اَب ہم ہر مبحث پر علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں :

★ توحید

امامیہ عقائد کے لحاظ سے ہر ہوش مند کا عقلی فرض ہے کہ وہ اپنے آفریدگار کو پہچانے۔ اس کی معرفت حاصل کرے اور اس کی وحدانیت و الوہیت کا معتقد ہو۔ ربوبیت میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دے۔ اس کا یقین رکھے کہ خلق و رزق، موت و حیات اور ایجاد و اعدام اسی کی ذات سے متعلق ہے بلکہ اس عالمِ ہست و بود" میں صرف اسی کی قدرتِ کاملہ کا عمل دخل ہے۔

اور اگر رزق و خلق یا موت و حیات کو کوئی شخص خدا کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرے تو اسے کافر و مشرک اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اطاعت و عبادت میں اخلاص ضروری ہے یعنی اگر کوئی معبودِ مطلق کے ساتھ کسی اور شئے کی عبادت بجالائے۔ اس کے سوا کسی اور کی پرستش کرے، نیز اسے تقرب کا وسیلہ بنائے تو وہ بھی امامیہ مذہب کے حکم سے کافر متصور ہوگا۔

سوائے خدائے وحدہٗ لاشریک کے کسی کی عبادت

جائز نہیں۔ نیز ذاتِ باری تعالیٰ، انبیائے کرام اور آئمۂ اطہار کے علاوہ کسی اور کی اطاعت بھی روا نہیں۔

انبیاء اور آئمہؑ کی اطاعت بھی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ یہ احکامِ الٰہی کے مبلغ ہیں۔ لیکن خدا کی عبادت سمجھ کر ان کی اطاعت ناجائز ہے اور قطعاً شیطانی فریب!

البتہ ان ذواتِ مقدسہ سے طلبِ برکت اور انہیں اپنے اور اپنے معبود کے درمیان وسیلہ قرار دینا، نیز ان کے مزاروں پر اللہ کی عبادت بجالانا جائز ہے، کیونکہ یہ پرستش ان کی نہیں، خدا کی ہے۔ اور یہ ایک واضح سا فرق ہے۔

حسبِ ارشادِ باری تعالیٰ:

فِی بُیُوتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ ۱؎

(وہ گھر جنھیں اللہ نے بلند ہونے کی اجازت دی اور ان میں اس کا ذکر ہوتا ہے)

ان پاکیزہ بارگاہوں میں معبودِ برحق کی عبادت درست ہے۔ یہ ہے امامیہ فرقے کا عقیدۂ توحید" جس پر ہمارے تمام علماء متفق و متحد ہیں۔ بلکہ ہم نے جتنا بیان کیا ہے مسئلہ

۱؎ سورۂ نور۔ آیت: ۳۶

وحدانیت" اِس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کے کئی درجے قرار دیئے گئے ہیں۔ مثلاً توحیدِ ذات، توحیدِ صفات، توحیدِ افعال وغیرہ۔ چونکہ ہمیں اختصار کا لحاظ ہے۔ بنا بریں طوالت سے دامن بچا رہے ہیں۔

★ نبوّت

نبوّت کے بارے میں امامیہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء جو منصوص من اللہ ہیں، وہ سب کے سب خدا کے فرستادہ اور اس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ سب دُنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث کیئے گئے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء اور سید المرسلین ہیں، آپ بالکل معصوم تھے۔ سرکارؐ سے نہ کوئی گناہ سرزد ہوا نہ لغزش، زندگی بھر حضورؐ مرضیِ حق کے مطابق عمل کرتے رہے، اور مالکِ مطلق نے آپ کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔ وہاں سے آپ اپنے جسمِ مبارک کے ساتھ عرش و کرسی نیز ماورائے حجب و سرادق تک پہنچے، اور اپنے معبود سے اتنے قریب ہوگئے کہ "قاب قوسین" بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

اللہ کی وہ کتاب جو اِس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگارِ عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا۔ اور اس کے ذریعے احکامِ دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی۔ مسلمانوں میں جو لوگ تحریف

کے قائل ہیں، وہ خطا پر ہیں۔ کیونکہ اس اعتقاد سے نصِ کتاب: اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُونَ[لہ] کی تردید ہوتی ہے۔

تمام علماء کا اس پر اجماع ہے اور اس کے خلاف کوئی روایت ملے بھی تو غیر معتبر ہوگی۔ کیونکہ جو حدیثیں طریق آحاد سے دستیاب ہوتی ہیں وہ مفید علم و عمل نہیں قرار پا سکتیں۔ بالفاظِ دیگر ان کا کوئی اعتبار نہیں، نیز شیعہ امامیہ کا یہ عقیدۂ راسخہ ہے کہ حضرت محمد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے بعد جو شخص بھی نبوّت یا نزولِ وحی کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے، اور واجب القتل۔

لہ "اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔" (سورۂ حجر، آیت: ۹)

★ امامت

امامت! یہی وہ امتیازی مسئلہ ہے جس کی بناء پر شیعہ فرقہ عام فرقوں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ اساسی اور بنیادی فرق ہے جو اس مکتبِ خیال کو عام مکاتب سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں، ان کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ فروعی ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور ضمنی اختلافات خود سوادِ اعظم کے آئمہ اجتہاد میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً حنفیوں کے بہت سے مسائل شافعیوں سے میل نہیں کھاتے۔ اور ان کے اُن سے۔ امامیہ فرقے کے نزدیک امامت وہ منصبِ الٰہی ہے جو نبوّت کی طرح پروردگارِ عالم کی جانب سے ہدایتِ خلق کے لئے عطا ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب باری عزّ اسمہٗ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ وہ علیؑ ابنِ ابی طالب کو اپنا جانشین کریں۔ تاکہ ختمِ نبوّت کے بعد کارِ تبلیغ جاری رہے۔

رسولِ اکرمؐ کو معلوم تھا کہ یہ عہدہ لوگوں کو کھٹکے گا

اکثر اسے بھائی کی چاہت، اور داماد نوازی پر محمول کریں گے۔

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس زمانے سے لیکر آج تک مُسلمان رسُولؐ کی واقعی بے لوثی اور حقیقی عصمت کے مُعاملے میں متحد الایمان نہیں نظر آتے۔ لیکن قدرت نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اور بالکل صاف صاف لفظوں میں حکم دیا:

یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (اے رسُولؐ! تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اس کا فوراً اعلان کر دو۔ اور اگر مفوّضہ کام کی انجام دہی میں ذرا بھی تساہل برتا تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم نے کارِ رسالتؐ انجام ہی نہیں دیا)[1]

اِس صُورت میں سوائے تعمیلِ حکم کے اور کیا چارہ تھا؟ چنانچہ آپ نے حجۃ الوداع کے بعد غدیرِ خم" میں لوگوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا:

◆ "اَلَسْتُ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ" ◆

کیا میں تمام مومنین سے اولیٰ نہیں ہوں؟

[1] سُورۂ مائدہ: آیت ۶۷

یعنی میری ذات سب پر مقدم نہیں ہے؟

پُورے مجمع نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ بے شک رسُولِ مقبولؐ آپ ہم سب سے اولیٰ ہیں۔

اِن گواہیوں کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا:۔

◆ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔ ◆

"جن لوگوں نے میری ولایت کو تسلیم کیا، یہ علیؑ بھی ان کا ولیِ امر ہے" تا آخر خطبہ[1]

اِس کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر اِس حقیقت کی توضیح و تصریح فرمائی ہے۔ گاہے اشاروں میں اور کبھی کھلم کھلا حضورؐ نے اپنا فرض پُورا کر دیا۔ حکمِ خُدا کی تعمیل ہو گئی لیکن ختم المرسلین کی آنکھ بند ہوتے ہی بعض دیدہ دِلیر مسلمان حقیقت پر پردہ ڈالنے کے درپے ہو گئے۔ نصِ صریح کی تاویل کی گئی اور اپنے اجتہاد سے احکام میں تغیّر و تبدّل کرنے لگے، نتیجۃً جو ہُوا ظاہر ہے۔

بہرحال! علیؑ اور ان کا گروہ جو بڑے بڑے جلیل القدر

[1] اس موضوع پر حجۃ الاسلام شیخ عبد الحسین امینی مرحوم کی انسائیکلو پیڈیائی تصنیف "الغدیر" کی ۱۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ قابلِ دید کتاب ہے۔

صحابیوں پر مشتمل تھا، اس خود ساختہ روش سے علیحدہ رہا اور اس جماعت کے ہر فرد نے بیعت سے انکار کر دیا۔

چنانچہ امیر المومنینؑ مصالحِ دینی کے پیشِ نظر ایک زمانے تک تو خاموش رہے مگر جب معاویہ نے اسلامی حکومت و اقتدار کو اپنے زیرِ نگیں کرنا چاہا، اور اس ضمن میں اس نے مختلف تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں تو علیؑ ابن ابی طالب معارض ہوئے۔ کیونکہ معاویہ جیسے شخص کی موافقت اور اس کے غلط طرزِ حکمرانی کو طرح دینا، اسلامی مفاد کے لئے زہرِ ہلاہل تھا۔ اور دینِ الٰہی کی حفاظت علیؑ کا سب سے بڑا فرض!

مختصر یہ کہ امامیہ حضرات اِس امر کے معتقد ہیں کہ ہم علیؑ کے ساتھی ہیں، اور آپ ہی کے پیرو۔ علیؑ جس کے دوست ہم اس کے دوست اور علیؑ جس کے دشمن ہم اس کے دشمن!

یہ اعتقاد پیغمبرِ اکرمؐ کے اِس ارشاد پر مبنی ہے:

◆ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ۔ ◆

"پروردگار! جو علیؑ کا دم بھرے تو اُسے دوست رکھ۔

اور جو علیؑ سے بغض باندھے تو بھی اس سے دشمنی کر۔

امامیہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خلاقِ عالم صفحۂ گیتی کو کبھی کسی نبی یا وصی کے وجود سے خالی نہیں رکھتا۔ عام اس سے کہ یہ حجت "ظاہر ہو یا غائب"!

سرورِ کائناتؐ نے "نصِ صریح" کے ذریعہ علیؑ مرتضیٰ کو اپنا وصی بنایا۔ علیؑ نے حسن مجتبےٰ کو جانشین کیا، اور امام حسنؑ نے اپنے بھائی سید الشہداء امام حسینؑ علیہ السلام کو یہ امامت سپرد کی۔ اس طرح یہ سلسلہ گیارھویں امام تک پہنچا۔ گیارھویں رہبر امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے بارھویں امام حضرت مہدی منتظر سلام اللہ علیہ کو صاحب الامر قرار دیا۔

یہ اعتقاد شیعوں کی اُپج نہیں بلکہ ایک "سنتِ الٰہیہ" ہے جو آدمؑ سے ـــ خاتمؐ تک پہنچی۔

اس موضوع پر اعاظم علماء کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ ہم قرونِ اولیٰ اور صدرِ اول کے اُن چند ممتاز علماء کے نام درج کرتے ہیں، جنھوں نے وصیت کے عنوان پر قلم فرسائی کی ہے۔

۱۔ "الوصیۃ" ہشام ابن الحکم

۲۔ "الوصیۃ" حسین ابنِ سعید
۳۔ "الوصیۃ" حکم ابنِ مسکین
۴۔ "الوصیۃ" علی ابنِ مغیرہ
۵۔ "الوصیۃ" علی ابن الحسین ابن الفضل
۶۔ "کتاب الوصیۃ" محمّد ابن علی ابن الفضل
۷۔ "کتاب الوصیۃ" ابراھیم ابن محمّد ابنِ سعید
۸۔ "الوصیۃ" احمد ابن محمّد خالد البرقی صاحبُ المحاسن"۔
۹۔ "الوصیۃ" مورّخ جلیل عبد العزیز ابن یحییٰ الجلمودی۔

اِن میں سے اکثر لکھنے والے قرنِ اوّل اور قرنِ دوّم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے مولّفات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ مثلاً:

۱۔ "الوصیۃ" یحییٰ ابنِ مستفاد۔
۲۔ "الوصیۃ" محمد ابن احمد الصابونی
۳۔ "الوصیۃ" علی ابن رئاب
۴۔ "الوصیۃ" محمّد ابن الحسن ابن فروخ
۵۔ "اثبات الوصیۃ والامامۃ" مورخ شہیر علی ابن الحسین المسعودی صاحب مروج الذہب"۔
۶۔ "الوصیۃ" شیخ الطائفۃ محمّد ابن الحسن الطوسی۔

۷۔ "الوصایا" محمّد ابن علی الشلغمانی
۸۔ "الوصیۃ" موسیٰ ابن الحسن ابنِ طاہر۔

اور چوتھی صدی ہجری کے بعد جو کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان کا تو شمار ہی مشکل ہے۔

مسعودی اپنی مشہور کتاب "اثبات الوصیۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہر نبی کے بارہ وصی ہوئے!"

مولّف نے سب کے نام اور مختصر حالات بھی قلم بند کئے ہیں۔ اور آخر میں آئمۂ اثنا عشر کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ایران میں چھپ چکی ہے۔

★ وجودِ حجّت

البتہ وجودِ حجّت کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں حلقوں سے شیعوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے لہٰذا چند جملوں میں ہم اس حقیقت کی بھی توضیح کرتے چلیں: معترضین کا خیال ہے کہ شیعہ ایک بے بنیاد مضحکہ خیز عقیدے کے قائل ہیں، لیکن جب ہم اعتراض کرنے

والوں کی فِکر کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نافہمیدہ سُوالوں پر مبنی ہے۔

☆ پہلا سوال یہ کہ طبعی طور پر، ایک شخص ہزار برس سے زیادہ کیسے جی سکتا ہے؟

☆ دُوسرا سوال یہ کہ آپ کے غائب ہونے میں کون سی مصلحت کارفرما ہے؟ اور ایک" غائب امامؑ کے وجُود سے فائدہ؟ — ہونا نہ ہونا دونوں برابر۔

پہلے اشکال کے متعلق ترقیم ہے کہ ذرا عمرِ نوحؑ کا خیال رہے۔

قرآنی تصریحات کے مطابق جنابِ نوحؑ نے نوسو برس اپنی قوم میں گذارے، اور علماء نے آپ کی عمر کا جو اندازہ لگایا ہے وہ کم سے کم ایک ہزار چھ سو سال ہے اور بہت سے دیدہ ور افاضل تو تین ہزار برس کی خبر لائے ہیں۔!

حضرتِ نوحؑ کے علاوہ بھی جمہور کے علمائے حدیث دُوسری ہستیوں کی درازیِ عمر کا اقبال کرتے ہیں۔ محدّث کبیر نووی اپنی کتاب "تہذیب الاسماء" میں ذکر فرما ہیں کہ جنابِ خضرؑ کی عمر اور نبوّت کے ضمن میں اگرچہ علماء مختلف الآرائے ہیں لیکن محققین کی اکثریت اِس امر کی معترف ہے کہ جنابِ خضرؑ موجود ہیں، اور صُوفیائے کرام تو بالاتفاق آپ کی حیات پر

مصر ہیں۔ چنانچہ آپ کے دِیدار، ملاقاتوں اور سوال وجواب وغیرہ کی اَن گِنت حکایات مشہور ہیں۔

شیخ ابوعمرو ابن صلاح نے اپنے "فتاوے" میں تحریر کیا ہے کہ جنابِ خضرؑ کے بارے میں جمہور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ زندہ ہیں، لیکن بعض محدثین اس کا اقرار نہیں کرتے اور خیال پڑتا ہے کہ ایک دُوسرے موقعہ پر موصوف یُوں رقم طراز ہیں۔ نیز زمخشری نے "ربیع الابرار" میں تحریر کیا ہے کہ:

"تمام مسلمان متفقاً چار انبیاء کی حیات اور وجُود کے قائل ہیں۔ ان میں سے دو آسمان پر ہیں۔ یعنی عیسیٰؑ اور ادریسؑ اور دو زمین پر، اور یہ ہیں خضرؑ و الیاسؑ۔"

جنابِ خضرؑ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے، اور ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جنھوں عمرِ طبیعی کی حدیں گزار کر زندگی کی سینکڑوں بہاریں دیکھیں۔

علامہ سیّد مرتضیٰ نے اپنی کتاب "امالی" میں کچھ لوگوں کا ذکر کیا ہے اور صدوق علیہ الرحمۃ نے "اکمال الدین" میں اِس سے بھی زیادہ طویل فہرست درج فرمائی ہے۔

عہدِ حاضر میں بھی ایسے اشخاص مِل جاتے ہیں جنھوں نے

وجود صاحبؑ کے بارے میں مضمون جاری ہے

ایک سو تیس سال اور بعضوں نے اس سے بھی کچھ زیادہ زندگیاں پائی ہیں۔

اور دیکھئے! اگر آپ منطقی طور پر سوچیں گے تو معلوم ہو گا کہ جو شخص ایک دن کی زندگی بچانے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے وہ حفاظتِ حیات کے سلسلے کو کئی ہزار سال تک بھی طُول دے سکتا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ اسے "خرقِ عادت" —— قرار دیں گے۔ اچھا۔ یہی سہی۔ تو کیا انبیاء و اولیاء کے معاملات میں "خرقِ عادت" کوئی عجیب و غریب بات ہے؟

"مجلۃ المقتطف" کے پرانے شمارے اُٹھا کر دیکھئے! اس موضوع پر علمائے مغرب کے مقالے بھرے پڑے ہیں، جن میں انھوں نے سائنٹفک طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان دُنیا میں حیاتِ جاوداں حاصل کر سکتا ہے، اور بعض مغربی مفکر کہتے ہیں کہ:

"اگر ابنِ ملجم کی تلوار نہ ہوتی تو علیؑ ابن ابی طالبؑ حیاتِ ابدی کے مالک تھے۔"

کیونکہ کمال و اعتدال کی جملہ صفتیں آپ کی ذات میں جمع تھیں۔ اس مبحث میں بہت کچھ شامل کیا جا سکتا ہے، مگر زیادہ گنجائش نہیں۔

دُوسرے اعتراض کے سلسلہ میں گزارش ہے کہ صاحب! کیا یہ قومِ خُدا کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے آگاہ ہونا چاہتی ہے؟ جملہ اسرارِ تکوینی و تشریعی سے واقفیت مطلوب ہے؟ اگر یہی منشاء ہے تو پھر بسم اللہ —— مگر اتنا ضرور غور کر لینا چاہیئے کہ حجابِ مصلحت میں اس کے علاوہ تو اور کوئی راز پوشیدہ نہیں۔

پارۂ سنگ نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، لیکن اس کے باوجود حجرِ اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے! بتایئے کون سی حکمت مستور ہے؟

مغرب کی نماز تین رکعتوں میں ادا ہو جاتی ہے عشاء کی چار رکعتیں پڑھنا پڑتی ہیں۔ صبح کو دو ہی رکعت میں فرض پُورا ہو جاتا ہے، کہیئے اس میں کیا مصلحت ہے؟

نیز یقین مانیئے بہت سے ایسے امور بھی ہیں جن کا علم نہ کسی مَلَکِ مقرب کو ہے اور نہ نبیِ مرسل کو۔ مثلاً "علم الساعۃ" باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ [1]

[1] اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی مینھ برساتا ہے۔
سورۂ لقمان۔ آیت: ۳۴

علاوہ ازیں اور باتیں بھی ہیں جو پردۂ خفا میں رکھی گئی ہیں اور مصلحت نامعلوم! مثال کے طور پر اسمِ اعظم، شبِ قدر، ساعتِ استجابتِ دُعا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اِس تمہید سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ باری تعالیٰ کے ان احکام و افعال کے سِلسلہ میں جن کی حکمت غیر ظاہر ہو حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے، کہ آیا وہ حکم یا فعل وجود رکھتا ہے یا نہیں؟

اب اگر پیغمبرِ اکرمؐ اور ان کے اوصیائے معصومینؑ کے اقوالِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے تو ہمیں بس! تسلیم کرنا پڑے گا، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں! بحثِ حکمت لاحاصل اور لِم کی تلاش بے سُود۔

امکانی طور پر ہم نے کوشش کی ہے کہ اِس مختصر سے رسالے میں دلائل و براہین کا انبار نہ لگنے پائے۔ کیونکہ سیر حاصل بحث کے لئے بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں اور قائم آلِ محمدؐ کے متعلق فریقین کے علمی خزانوں میں مُستند احادیث کا کافی ذخیرہ محفوظ ہے۔

مصالحِ غیبت کے سلسلے میں اگرچہ کہ ہم اِس حقیقت کے معترف ہیں کہ "خُدا اپنی حکمت خود بہتر جانتا ہے"

پھر بھی اِستفسار کرنے والے بعض شیعہ حضرات کے جواب میں بہت سے معقول وجوہ پیش کئے جا چکے ہیں، جن کے اعادے کی یہاں وسعت نہیں۔

نیز اِس ضمن میں فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں امام کا ہونا ضروری ہے۔ "دُنیا حجت سے خالی نہیں رہ سکتی، اِس کا وجود بھی لطف ہے اور تصرّف بھی لطف"۔ لہٰذا مصلحت کا سوال ساقط۔ اور غیبت کا اقرار لازم!

★ عدل

خُداوندِ عالم کسی پر ظلم نہیں کرتا ، اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جسے عقلِ سلیم بُرا سمجھے۔ اِس اعتقاد کا نام ہے "عدل"۔

عدل، باری تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے جس کا وجود جامعیّت صفاتِ کمال و جمالِ الٰہیہ کے لئے ضروری اور شانِ توحید کے واسطے لازم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اشاعرہ نے اِس مسئلہ میں امامیہ اور معتزلہ کی مخالفت کی۔ (امامیہ اور معتزلہ کو عدلیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اور وجہ مخالفت یہ تھی کہ اشاعرہ حُسن و قبح "کے عقلی ہونے کے منکر ہوکر یہ کہنے لگے کہ حسن (اچھی) وہ شے ہے جسے شریعت حسن کہے اور قبیح (بُری) وہ چیز ہے جسے شرع قبیح قرار دے یہاں تک کہ انھوں نے معرفت صانع اور پیغمبروں کی پہچان کے لئے معجزات کی جانچ پڑتال کو بھی سمع و شرع کے طریقوں پر محمول کیا۔ نیز حکم خرد کو بالکل ساقط کردیا۔ نتیجۃً وہ "دور اور استحالے" کے چکر میں پڑ گئے۔

لیکن عدلیہ یعنی امامیہ، اور معتزلہ اِس عقیدے

پر قائم رہے کہ ان نظریات میں فیصلہ عقل کے ہاتھ ہے۔ شریعت کو کوئی دخل نہیں ، البتہ شرعی احکام سے تاکید اور ہدایت ہوتی ہے۔

عقل بعض افعال کو اچھا سمجھتی ہے اور بعض کو بُرا اور اسی عقل کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ "فعلِ قبیح" ذاتِ باری کے لئے محال ہے۔ کیونکہ وہ حکیم ہے اور فعلِ قبیح، منافیِ حکمت!

فرماں بردار کو مبتلائے عذاب کرنا ظلم ہے' اور ظلم' فعلِ قبیح ہے' جو پروردگارِ عالم سے نہیں واقع ہوسکتا۔

نظر بر ایں امامیہ، فرقے نے مسئلہ عدل پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی۔ نیز خداوندِ عالم کی اِس صفت کو "اصُولِ دین" میں شامل کرلیا۔ ہاں! یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اشاعرہ خود بھی عدل کے منکر نہیں ہیں البتہ اس ضمن میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایزدِ متعال خواہ کچھ کرے بہرحال عدل و خوبی میں فرق نہیں آسکتا ، وہ خیال کرتے ہیں کہ بھلا عقل کی کیا ہستی جو یہ فیصلہ کرے کہ خُدا کے لئے یہ مناسب تھا اور یہ نامناسب۔

لیکن امامیہ، اِس حقیقت کو ثابت کرتے چلے آرہے

کہ ہر چیز کی اچھائی بُرائی پرکھنے کا صحیح معیار عقل ہے، اسی کے ذریعے ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذاتِ باری کو ہر خُوبی سے متّصف اور ہر بَدی سے منزّہ ہونا چاہیئے۔ اسی "نظریۂ حُسن و قبحِ عقلی" کی اَساس پر علمِ کلام کے اور بھی قواعد مرتّب ہوئے۔ مثلاً قاعدۂ "لطف و وجوب شکرِ منعم" اور معجزے میں "وجوبِ نظر"۔ نیز مسئلۂ "جبر و اختیار" کی بنیاد بھی یہی ہے "جبر و اختیار" ان غیر معمولی مسائل میں سے ہے جن پر ایک زمانے تک بحث ہوتی رہی۔

اشاعرہ جبر کے قائل تھے۔ اور معتزلہ و امامیہ کا خیال تھا کہ ہر انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ اپنے ارادے سے سب کچھ کر سکتا ہے اور اپنی مشیّت سے اپنے اعمال بجالاتا ہے۔ نفسِ وجُود کی طرح ملکۂ اختیار بھی اللہ کی دَین ہے، خالقِ کائنات نے بندوں کو پیدا کیا، اور انھیں اختیارات دے دیئے۔ البتّہ اختیارِ عام یا اختیارِ کُلّی خُدا ہی کو حاصِل ہے لیکن جزئیات میں ہم بالکل آزاد ہیں۔

پروردگارِ عالم نہ کسی اِنسان کو کسی کام کے واسطے مجبور کرتا ہے اور نہ اس کے ترک کے لئے۔ بلکہ فرزندانِ آدم خود ہی مَن مانی کرتے ہیں۔

اسی بناء پر عقل اور عقل مندوں نے ان کی مدح و ذم کو جائز سمجھا ہے اور سزا و جزاء کو درست، اگر کسی نے کوئی نیک کام کیا ہے تو یقیناً اس کی تعریف کی جائے گی لیکن غلط کاروں کو قرار واقعی سزا سے کیونکر چھٹکارا مِل سکتا ہے؟

پھر اگر ہم اِس قاعدے کو نہ مانیں تو ثواب و عقاب کا نظریہ ہی باطل ہُوا جاتا ہے۔ بعثتِ انبیاء و نزُولِ کتب بے سُود اور وَعدہ و عید لاحاصِل۔

اِن صفحات میں اِس سے زیادہ گنجائش نہیں۔ اِس مسئلے پر ہم اپنی کتاب "الدّین والإسلام" کے حصّۂ اوّل میں کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں مذہبِ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ:

اللہ عادل ہے، اور انسان آزاد خود مختار!

★ معاد

عام مسلمانوں کی طرح شیعوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ پیدا کرنے والا سزا و جزا، اور حساب و کتاب کے لئے قیامت کے دن تمام مخلوق کو زندہ محشور کرے گا۔

معاد کے معنیٰ یہ ہیں کہ:

ہر شخص بذاتِ خود بعینہٖ اپنے جسم و رُوح کے ساتھ میدانِ حشر میں اِس طرح حاضر ہوگا کہ پہچاننے والا دیکھ کر کہہ دے 'ہاں' یہ فلاں آدمی ہے!

اِس سلسلہ میں یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ واپسی کس انداز سے ہوگی ___ اعادۂ معدوم کے طور پر___؟ ظہورِ موجود کے قبیل سے ہے؟___ یا کوئی اور طریقہ ہوگا؟ نیز حشر و نشر کے ضمن میں کتابِ خدا اور احادیثِ صحیحہ میں جو کچھ ارشاد ہُوا ہے۔ وہ سب جزوِ ایمان ہے، جیسے عقیدۂ دوزخ و بہشت۔ برزخ کی آسائش اور عذابِ میزان، صراط، اعراف اور وہ اعمال نامہ جو زندگی کا مرقع ہوگا۔

علاوہ ازیں شیعہ اِس کے بھی معترف ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے سزا و جزا کا مستحق ہوگا۔ نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝

(جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کے سامنے آئیگی اور جس نے ایک ذرّہ برابر بھی بُرائی کی ہوگی، اسے وہ دیکھنا پڑے گی)۔

(سورۃ الزلزال۔ آیت: ۷-۸)

نظامِ عمل

★ پیش لفظ

امامیہ، شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ شریعتِ اسلامی کی رُو سے زندگی کے جملہ مُعاملات میں پروردگارِ عالم کا کوئی نہ کوئی فرمان موجود ہے۔ قانونِ الٰہی نے معمولی سی خراش کی دیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

غرض کسی مکلف کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں ملے گا، جو مندرجہ ذیل احکام میں سے کسی حکم کے دائرے میں نہ ہو۔

اما مت کے بارے میں آیۃ اکمال ملاحظہ ہوں۔ اور بلیغ حاشیے میں آیت نمبر اور ترجمہ دیکھیں

واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح

لین دین ہو یا قول و قرار، شرع ضرور بتائے گی کہ یہ درست ہے یا نادرست!

★ سرچشمہ:

پیغمبرؐ کی ذاتِ بابرکات احکامِ الٰہیہ کا سرچشمہ ہے، باری تعالیٰ نے وحی و الہام کے ذریعہ یہ احکام سرکارِ ختمی مرتبت کو ودیعت فرمائے۔ آپ نے حسبِ تقاضائے حال لوگوں کو واقف کرایا، اور خاص طور سے ان اصحاب کو جو ہمہ وقت حاضرِ بارگاہ رہتے تھے۔ تاکہ بمصداق آیۂ مبارکہ

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ
يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ؕ [1]

وہ پوری دُنیا میں تبلیغ کرتے رہیں۔

مگر بہت سے حکم ایسے بھی تھے جن کی تعلیم نہیں دی جا سکی۔ خواہ اِس وجہ سے کہ ان کے لئے موقع نہ تھا، یا

۱؎ سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۴۳: تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو — اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔"

اِس لئے کہ پیغمبرؐ کے زمانے میں ان ضوابط کی ضرورت نہیں پڑی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مصلحت کی بناء پر عام نہ کیے گئے ہوں۔

اِسی لئے کچھ احکام مشہور ہو گئے اور کچھ مستور رہے، لیکن نبی کریمؐ نے ان پوشیدہ احکام کو اپنے اوصیاء کے سپرد فرما دیا۔ بعد ازاں ہر وصی اپنے جانشین کو بتاتا رہا کہ حسبِ اقتضائے زمانہ اور مناسبتِ وقت ان کی اشاعت ہوتی رہے۔

★ اختلاف

رسولِ مقبولؐ نے جس طرح اور جس قدر مناسب سمجھا بیان فرمایا۔ اور صحابہ نے بھی اپنی اپنی فہم کے مطابق جو سمجھ میں آیا وہ سمجھا۔ ابرِ رحمت تو کھُل کر برسا، مگر فیض حاصل کرنے والوں کا اپنا اپنا ظرف ___ پھر سب کی ذہنی توانائیاں یکساں بھی تو نہیں ہوتیں ؎

من و طوبیٰ و سرو و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ایسا بھی ہُوا کہ ایک صحابی کسی معاملہ میں مثبت حکم پاتا ہے، اور دوسرا اسی سے ملتے جُلتے واقعہ میں منفی حکم سُنتے ہیں

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فعل ایک اور احکام دو۔ یہ کتنا صریحی اختلاف ہوا؟ اچھا! اب اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟ بات یہ ہوگی کہ ان دونوں مواقع میں سے کسی ایک میں کوئی قرینہ ہوگا، کوئی خاص پہلو ہوگا۔ نقل کرنے والے یا تو اس قرینے اور تخصیص کی طرف متوجہ نہیں ہوئے یا توجہ تو کی، مگر خصوصیت اور قرینہ کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا حدیثوں میں ظاہری فرق تو نظر آسکتا ہے لیکن واقعی اختلاف کا شائبہ تک نہیں۔

★ اجتہاد

اسی قبیل کے مختلف اسباب پیدا ہوئے جس کی وجہ سے صحیح حکم شناسی میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ بنابریں اور تو اور خود وہ اصحاب جنھیں رسولؐ کی خدمت کا شرف حاصل تھا، اجتہاد کا سہارا لینے لگے۔ چنانچہ حدیثوں کے گننے اور پرکھنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ قرائن کی چھان بین ہونے لگی۔ کیوں کہ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا کہ حدیث کا ظاہری مطلب کچھ ہوتا ہے اور شارع کا مقصد و منشا کچھ اور ہوتا ہے۔ قبل ازیں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اس تفاوت کے اسباب میں نقل کی خامی یا ناقلوں کی کوتاہی کو بڑا دخل ہے۔

★ مُجتہد:

رسالت مآبؐ کے وہ اصحاب جو صاحبُ الرائے اور اہلِ روایت تھے۔ انھوں نے بھی کبھی تو پیغمبرؐ کے قول کو بعینہ ان ہی الفاظ میں دُہرا دیا جن لفظوں میں سُنا تھا، اور گاہے نفسِ حدیث کی جگہ وہ حکم بیان کردیا جو متعلقہ حدیث سے اخذ کیا تھا۔

پہلی صورت میں ان کی حیثیت راوی اور محدّث کی ہوتی ہے اور دُوسری شکل میں وہ مفتی اور صاحبِ رائے کی شان رکھتے ہیں۔ "جن میں یہ ملکہ ہو انھیں مجتہد کہا جاتا ہے۔"

★ مُقلِّد:

اور وہ عام مسلمان جو اس مرتبہ پر فائز نہ ہوں اور مجتہد کی رائے پر عمل پیرا ہوں، انھیں مقلّد کا نام دیا جاتا ہے۔

الحاصل اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آں حضرتؐ کے زمانے ہی میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور خود آپ کے اصحاب اس پر عامل تھے البتّہ اس عہد میں اجتہاد اتنا توانا نہیں تھا جتنا اب ہے، کیونکہ لوگ براہِ راست

پوچھ سکتے تھے۔ قرائن وافر تھے۔ علمِ قطعی حاصل کرنے کے تمام
ذرائع موجود تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا نبوت سے
دوری ہوتی گئی۔ عربوں اور عجموں میں میل جول بڑھا۔ عربی
زبان کے صحیح مطلب سمجھنے میں دقتیں ہونے لگیں۔ احادیث
و روایات کی بہتات ہوئی جن میں بہت سی مشکوک اور موضوع
روایتیں بھی تھیں۔ کثرت سے جھوٹے اقوال پیغمبرؐ کی جانب
منسوب ہونے لگے۔ اس منزل پر احکامِ شریعت کا پرکھنا آسان
کام نہ تھا۔ نظر بریں "اجتہاد" نے قوت حاصل کی۔ استنباطی
طریقوں میں زور آیا۔ صحیح و سقیم میں امتیاز ہوا۔ "اصولِ ترجیح"
سے کام لیا گیا۔ بہرکیف ضرورتیں بڑھتی گئیں۔ مجتہد کاوش فرماتے
رہے اور دامنِ استنباط پھیلتا گیا۔

امامیہ فرقہ کے ہاں اب تک یہ نعمت موجود ہے۔

دیکھئے! ہمارا آپ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ تمام انسان دو
گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ باسواد، بے سواد (خواندہ و ناخواندہ)
نیز قدرتی طور پر بے سواد جماعت کو اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے
باسواد طبقہ کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے اسی طرح شریعت
کی دنیا میں بھی دو فریق ہیں۔ "عالمِ مجتہد" اور "جاہلِ مقلد"
قاعدے کے لحاظ سے دوسرے طبقہ کو مسائل سے واقفیت

حاصل کرنے کے لئے پہلے طبقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

عام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ
احکامِ شرع کا دارومدار "کتاب و سنت" اور اس کے بعد
"عقل و اجماع" پر ہے۔ البتہ امامیہ فرقہ حسب ذیل راستوں
میں دوسروں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

۱۔ قیاس:

شیعہ کبھی قیاس پر عمل نہیں کریں گے۔ کیونکہ تواتر
کے ساتھ ان کے آئمہ نے ارشاد فرمایا ہے: "اِنَّ الشَّرِیعَۃَ
اِذَا قِیسَت مُحِقَ الدِّین"۔۔۔ اگر شرعی معاملات میں
قیاس آرائیاں ہونے لگیں تو دین کا نقشہ بگڑ جائے گا۔ عمل
بالقیاس کی خرابیوں کو ہم واضح کرتے مگر موقعہ نہیں۔

۲۔ روایتِ غیر معتبر:

یعنی اگر حدیثِ رسولؐ اہل بیت اطہارؑ کی وساطت سے
ملے گی تو لائق اعتبار ورنہ ناقابلِ تسلیم! غیر معتبر! ابوھریرہ،
سمرہ بن جندب، مروان بن حکم، عمران بن حطان خارجی اور
عمرو بن عاص وغیرہم کے روایات کی ہمارے ہاں کوئی وقعت نہیں

اور شیعوں ہی پر کیا منحصر، خود علمائے اہلِ سنّت نے بھی ان راویوں کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔ خوب خوب پول کھولے ہیں۔

۴۔ عدمِ تقلید

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ شیعوں کے ہاں اجتہاد کا دروازہ آج تک کھلا ہوا ہے، اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔ برخلاف اس کے سوادِ اعظم میں ابواب استنباط مقفل ہیں۔ یہ عمل کب اور کس دلیل سے ہوا۔ اس سلسلہ میں غالباً خود ان کے علماء بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں رکھتے۔

اِن امور کے علاوہ باقی اختلافات فروعی ہیں۔

★ منصبِ اجتہاد

دلائل و براہین میں رچ کر جو شخص احکامِ شرعیہ کے اخذ و استنباط کی قوت حاصل کرے اسے منصبِ اجتہاد پر فائز سمجھنا چاہیئے۔ مگر صحتِ تقلید کے لئے اس کے علاوہ بھی کچھ شرطیں ہیں، سب سے اہم شرط عدالت ہے۔ عدالت سے مُراد وہ باطنی جوہر ہے جس کے ہونے سے انسان اپنی پوری زندگی میں معصیت سے بچنے اور تمام واجبات کی انجام دہی پر قدرت حاصل کر سکتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ خوفِ خدا کی وہ کیفیت جو

ہر حال میں دِل و دماغ پر طاری رہے۔ اس کے کئی درجے ہیں سب سے بڑا درجہ عصمت ہے، جسے **امامت** کی شرط قرار دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں "ضروریات" (وہ امور جن کا تعلق علمِ قطعی سے ہے) میں نہ تقلید ہے نہ اجتہاد! جیسے "وجوبِ صوم و صلوٰة" وغیرہ۔ اسی طرح "اصولِ دین" بھی تقلید و اجتہاد کی حدوں سے باہر ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق ہر مکلّف کے شخصی علم و تحقیق سے ہے اور جن حقائق کی واقفیت ہر شخص کی اپنی سمجھ بُوجھ اور ذاتی دانش و آگہی پر منحصر ہو، انھیں دُوسروں کی رائے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان کے سوا باقی جتنے بھی فروعی مسائل ہیں، وہ سب اجتہاد و تقلید کے دائرے میں ہیں۔

نیز مکلّفوں کے اعمال ہی احکامِ شریعت کا موضوع ہیں، لہٰذا ان کا جاننا ضروری ہے، اور جاننے کے بس دو ہی طریقے ہیں، تقلید یا اجتہاد۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان طریقوں میں سے اگر کسی طریقہ سے معرفت حاصل نہ کی تو قیامت کے دن سزا بھگتنا پڑے گی۔ اعمال کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ:۔

فقہ کے بارے میں جو وضاحت بلفظہ "فقہ" کے بیان میں رجوع فرمائیں

۱- کچھ عمل تو خدا اور بندے سے متعلق ہیں۔ یہ عباداتؔ کہلاتے ہیں۔ ان کی صحت خدا سے نزدیک ہونے کی نیّت پر موقوف ہے۔ (قربۃً الی اللہ)

عبادتیں یا تو جسمانی ہوتی ہیں جیسے نماز، روزہ، حج یا مالی جیسے خمس وزکوٰۃ وکفّارات۔

ب- اور کچھ اعمال فرد اور سماج سے متعلق ہیں، ان کی بھی دو صورتیں ہیں۔ دو فریقوں سے وابستہ، مثلاً لین، دین، شادی بیاہ۔ ایک ہی فریق سے مختص جیسے طلاق اور عتق وغیرہ۔

ج- نیز بعض عمل بالکل شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں، جیسے کھانا پینا، پہننا اوڑھنا۔

فقہ:

ان تمام اعمال کے جملہ احکام سے، فقہ چار ابواب میں بحث کرتی ہے:

☆ عبادات

☆ معاملات

☆ ایقاعات

☆ احکام

اہم ترین عبادتیں چھ ہیں۔ دو نری، جسمانی یعنی نماز۔ روزہ دو خالص مالی، یہ ہیں خمس وزکوٰۃ اور دو ملی جلی جنھیں حج وجہاد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ارشادِ باری ہے:

جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ [1]

تم اپنی جان و مال دونوں سے جہاد کرو!

اور کفّارات، چند خاص جرائم اور کوتاہیوں کی مخصوص سزائیں ہیں؛

[1] سورۂ توبہ، آیت: ۴۱

★ نماز

تمام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی نماز کو دین کا رکن سمجھتے ہیں۔ یہ عبادت بندے کو خدا سے نزدیک کرنے کا ایک وسیلہ ہے، جو کہیں یہ عمل چھوٹ جائے تو عبد و معبود کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے۔

اسی واسطے اہل بیتؑ کی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک دو نمازوں کا چھوڑنا ہی کفر و اسلام کا درمیانی فرق ہے۔

شریعت کی رو سے نماز کو بڑی اہمیت حاصل ہے کوئی عبادت بھی اس کے مقابل نہیں اور بالاتفاق فرقہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ "تارکِ صلوٰۃ" فاسق ہے! اسلامی معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ نہ وہ قابلِ اعتبار ہے نہ لائقِ اعتماد، نیز اس کی غیبت بھی جائز ہے۔

نماز کے سلسلہ میں بڑے سخت احکام ہیں۔

اصولاً پانچ قسم کی نمازیں واجب ہیں۔

فرائضِ پنجگانہ، نمازِ جمعہ، نمازِ عیدین، نمازِ آیات، نمازِ طواف۔ لیکن بعض وقت خود مکلف کسی وجہ سے اپنے اوپر نماز

واجب کر لیتا ہے۔ مثلاً نذر مان کر قسم کھا کر یا کسی کی قضا نمازیں پڑھنے کی اُجرت لے کر۔ ان کے علاوہ باقی سب نوافل ہیں۔

ہمارے ہاں نوافل میں سب سے اہم روزانہ نمازوں کے نافلے ہیں جو شمار میں واجب نمازوں سے دُگنے ہیں۔

روزانہ کے فرائض و نوافل کی مجموعی تعداد اکیاون (۵۱) رکعت ہے۔

ایک واقعہ

یہاں ہمیں ایک پُرلطف واقعہ یاد آگیا۔ راغب اصفہانی اپنی وقیع تصنیف "المحاضرات" میں لکھتے ہیں کہ احمد بن عبد العزیز کے زمانے کی بات ہے۔ اصفہان میں کنانی نامی ایک شخص تھا جس سے احمد پیش نمازی کے آداب سیکھتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن احمد کی ماں نے جھانک کر دیکھا، اور دیکھتے ہی کنانی سے کہنے لگی،

"اُستادِ محترم! آپ نے تو میرے لڑکے کو رافضی بنا دیا۔"

کنانی نے برجستہ جواب دیا۔ "معظمہ! رافضی تو روزانہ اکیاون اکیاون رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اور آپکا لڑکا اکیاون دن میں ایک رکعت بھی نہیں ادا کرتا۔ یہ رافضی کیسے ہو سکتا ہے؟"

آمدم برسرِ مطلب

اچھا! ان نمازوں کے علاوہ ماہِ رمضان کے نوافل کو بڑی عظمت و اہمیت

حاصل ہے، جن کی تعداد ایک ہزار رکعت ہے۔ ہمارے سُنّی بھائی بھی یہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ مگر جماعت کے ساتھ جو اُن کے ہاں "تراویح" کے نام سے مشہور ہیں۔

اور شیعی نقطۂ نظر سے ان نمازوں میں جماعت مشروع نہیں، کیونکہ کلیہ یہ ہے کہ "جماعت صرف واجب نمازیں ادا کرنے کے لئے ہے"۔

تفصیلات کے واسطے ہماری فقہ کے وہ ہزاروں مجلدات دیکھے جا سکتے ہیں، جو علمی دُنیا میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان میں کمال شرح و بسط کے ساتھ نماز کے تمام متعلقہ احکام، آداب، اذکار، اور اوراد، و ادعیہ وغیرہ درج ہیں۔

فقہی طور پر ہمارے ہاں صحیح نماز کی حقیقت کے ثبوت کا دار و مدار ان تین امور پر ہے:

۱۔ شرائطِ نماز

وہ اضافی قدریں جو چند بیرونی حقائق سے ماخوذ ہیں، اگرچہ ان میں سے کوئی بھی نفسِ نماز میں داخل نہیں، لیکن یہ سب ایسی بندھی ٹکی صفتیں ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز بالکل باطل ہو جاتی ہے۔

ان کی تعداد چھ ہے:

طہارت، وقت، قبلہ، ساتر، نیت، مقام "نماز کی جگہ" کو اگرچہ کہ رکن کی حیثیت نہیں حاصل ہے لیکن اس کا مُباح ہونا ضروری ہے۔ نیز اسی طرح جائے سجدہ کی پاکیزگی بھی لازم ہے۔

۲۔ اجزائے وجودی

وہ عناصر جن سے نماز کی صُورت گری ہوتی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

رُکنی — غیر رُکنی،

رُکنی، جن کے بغیر مطلق طور پر نماز باطل ہو جاتی ہے، یہ پانچ ہیں:

نیت (۱)، تکبیرۃ الاحرام (۲)، قیام (۳)، رکوع (۴)، سجود (۵)۔

غیر رُکنی یہ ہیں، قرائت، ذکر، تشہد، سلام، ترتیب، موالات۔

طمانینت ان سب میں ضروری ہے۔

اذان و اقامت مستحب موکد ہیں، بلکہ اقامت کا وجوب قوت سے خالی نہیں۔

۳۔ مبطلات

وہ امور جن کے ہوتے ہوئے نماز باطل ہو جاتی ہے، یہ بھی دو قسم کے ہیں:

رُکنی: مطلقاً باطل کر دینے والے۔ یہ تعداد میں تین ہیں:

حدث، استدبار، عملِ کثیر۔

غیر رُکنی: جنھیں قصداً اختیار کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے، ان کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

بولنا، آواز سے ہنسنا، اور اسی طرح رونا، دائیں بائیں دیکھنا، کھانا، پینا۔

طہارت سے مُراد وضو اور غسل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے واجب ہونے کے کچھ اسباب ہیں۔ لیکن پانی کی نایابی یا کسی اور مجبوری جیسے بیماری، زیادہ سردی یا تنگیِ وقت وغیرہ کے باعث اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پھر ان کا بدل تیمم ہے۔

فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا،

(اور پانی نہ ملے) تو پاک مٹّی سے تیمم کر لو۔

سورۂ نساء۔ آیت: ۴۳

فقہاء اور اربابِ لغت نے صعید کے معنوں میں اختلاف کیا ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ اِس سے مقصود صرف مٹّی ہے۔ بعض کے خیال میں بغیر کسی قید و شرط کے رُوئے زمین مُراد ہے، جس میں ریت، سنگریزے، پتھر اور غیر سوختہ معدنی اشیا وغیرہ سب شامل ہیں۔

نماز کے بارے میں یہ مختصر سی گفتگو تھی ——

اِس سلسلے میں بڑے زبردست اور طویل مُباحث ہیں جن کے لئے جلدیں کی جلدیں درکار ہیں۔

★ روزہ

امامیہ عقیدے کے مطابق روزہ شریعتِ اسلامیہ کا ایک رکن ہے۔ احکام کے لحاظ سے صیام کی چار قسمیں ہیں۔ واجب، مستحب، حرام، مکروہ۔ واجب روزے دو قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) شرع کے واجب کردہ۔ یہ ہیں ماہِ رمضان کے روزے۔

(۲) جو کسی سبب سے واجب ہوگئے ہوں جیسے صومِ کفارہ، بدلِ ہدی، نیابت اور نذر وغیرہ کے روزے۔

رجب و شعبان کے روزے مستحب ہیں۔ نیز ان کے علاوہ اور بہت سے سنتی روزے ہیں۔

عیدین اور ایامِ تشریق کے روزے حرام ہیں۔ نیز صومِ عاشور اور عرفہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

صیام کے کچھ شرائط ہیں، واجبات و مبطلات ہیں اور آداب و اذکار ہیں، اِس موضوع پر بھی ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

رمضانُ المبارک کے روزوں کا شیعہ اِس قدر التزام

کرتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ بہت سے لوگ تو مرض موت اور جان لیوا پیاس میں بھی اِس عبادت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

نماز اور روزہ خالص جسمانی عبادتیں ہیں۔

★ زکوٰۃ

شیعوں کے نزدیک نماز کے بعد زکوٰۃ کا مرتبہ ہے بلکہ آئمہ اطہار کی بعض حدیثوں میں یہ مضمون ملتا ہے کہ "جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز ہی درست نہیں"۔

عام مسلمانوں کی طرح امامیہ حضرات بھی ۹ نو چیزوں پر زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں۔

مواشی میں ـــــ اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکریاں۔

غلوں میں ـــــ گیہوں، جو، خرما، مویز (منقے)

نقدی میں ـــــ طلائی سکے، نقرئی مسکوکات۔

ان کے علاوہ تجارتی سامان، گھوڑوں نیز زمین سے پیدا ہونے والی تمام اشیاء جیسے دالوں اور ترکاریوں وغیرہ کی زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے۔

وجوب و استحباب کے کچھ شرائط و ضوابط ہیں، جو اپنے اپنے مقامات پر مذکور ہیں۔ اس سلسلے میں بیشتر قواعد "مذاہب اربعہ" یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے مطابق ہیں۔

زکوٰۃ کے مستحق حسب ارشاد باری تعالیٰ:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ ... تا آخر آیت

فقراء و مساکین ہی ہیں ـــــ (سورۂ توبہ - آیت: ۶۰)

★ زکوٰۃ فطرہ:

فطرہ ہر اُس بالغ و عاقل شخص پر واجب ہے جو خود مکتفی نیز اپنے اہل و عیال اور دوسرے تمام متعلقین کا معاشی بار اُٹھانے کی سکت رکھتا ہو۔

اس کی مقدار ہر فرد کی جانب سے گیہوں، جو، یا کھجوروں کا ایک صاع ہے۔ یہاں بھی شیعی مسائل سنیوں سے مختلف نہیں ہیں۔

★ خُمس

خُمس سات چیزوں پر واجب ہوتی ہے۔

دارالحرب کا مالِ غنیمت، غواصی (غوطہ زنی) سے حاصل شدہ جواہر و معادن و نباتات، پوشیدہ خزانے، معدنی اشیاء، حلال حرام آمیز کاروبار کے منافع، مسلم سے ذمّی کو منتقل شدہ اراضی۔

خُمس کی اصل و اساس پروردگارِ عالم کا یہ ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ [1]

"آگاہ ہو کہ جو اموال بطورِ غنیمت تمھیں دستیاب ہوں ان کا پانچواں حصہ خُدا، رسُول، ذی القربیٰ، ایتام، مساکین اور پردیسیوں کا ہے۔"

اِس ضمن میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خُمس وہ حق ہے جسے خُداوندِ کریم نے "آلِ مُحمّد" کے لئے مختص فرمایا ہے

[1] سورۂ انفال - آیت: ۴۱

کیونکہ نبی زادوں پر صدقہ حرام ہے، لہٰذا وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتے، ان کے لئے پروردگارِ عالم کی یہ عنایت اسی کا "نعم البدل" ہے۔

خمُس کے چھ حصے ہوتے ہیں۔ تین۔ اللہ، رسُولؐ اور ذی القربیٰ کے، جنھیں موجودگی کی صُورت میں امام علیہ السّلام کی خدمتِ اقدس میں پیش کرنا واجب ہے اور غیبت کی شکل میں یہ نائبِ امام یعنی مجتہدِ عادل کے حوالے ہوں گے، تاکہ ان محاصل سے وہ دینِ مبین کی حفاظت اور ملّتِ غرّا کے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل فرما سکیں۔ یہ ہے اس کا حقیقی مصرف —— نہ کہ وہ جسے سیّد محمُود آلوسی کی ذہنی بدعت کہنا چاہیئے۔

سیّد صاحب مذکور اپنی تفسیر میں ایک جگہ پر مزاحاً تحریر فرماتے ہیں کہ "اس زمانے میں تو ایسے حقوق کو سرداب میں رکھ دینا چاہیئے۔"

یہ دراصل اشارہ ہے اُس غلط افسانے کی طرف جو ان کے باپ دادا سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس قوم کے ہر چھوٹے بڑے سے سُن لیجئے۔ "شیعہ کہتے ہیں...... ان کے امام

سرداب میں غائب ہو گئے۔" حالانکہ سرداب کو غیبت سے کوئی ربط ہی نہیں۔ اثنا عشری حضرات تو اس لئے سامرہ کے تہ خانے کی زیارت کو جاتے ہیں کہ یہ امامِ ہمام کے تہجد کی جگہ تھی نیز حضور کے پدرِ بزرگوار اور جدِّ عالی تبار بھی اسی مقام پر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

خمس کے باقی تین حصص ہاشمی محتاجوں کا حق ہیں' یہ تھے **امامیہ** مذہب کے احکامِ خمس جو عہدِ رسالت سے لیکر اب تک نافذ العمل ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ کے بعد مسلمانوں نے آلِ ہاشمؑ کا حق چھین کر بیت المال میں جمع کر دیا" —— یہ گھرانا زکوٰۃ تو لے ہی نہیں سکتا تھا، خمس سے بھی محروم ہو گیا!

غالباً امام شافعی نے اپنی کتاب "الام" کے صفحہ ۶۹ پر اس جانب اشارہ کیا ہے۔ کہ "آلِ محمد جن کے لئے صدقے کی جگہ خمس مقرر ہوئی تھی نہ انھیں مقررہ صدقات میں سے کچھ مل سکتا ہے اور نہ وہ لے سکتے ہیں۔ نیز اگر دینے والا جانے کے باوجود دے بھی دے تو اُسے ثواب سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔"

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں: — اگر حقِ خمس سے انھیں محروم کر دیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ صدقہ وغیرہ جو

ان کے لئے حرام ہے' وہ اس جہت سے حلال ہو جائے گا"

ہاں! چونکہ مہربانوں نے حق ہی ساقط کر دیا، اس لئے سوادِ اعظم کے فقہی مجموعوں میں سرے سے یہ موضوع ہی ناپید ہے، اور انتہا یہ کہ خود امام شافعی کی کتاب بھی اس مبحث سے خالی ہے۔ البتہ **شیعوں** کی ہر چھوٹی بڑی تصنیف میں زکوٰۃ وغیرہ کی طرح خمس کو بھی ایک مستقل عنوان کی حیثیت حاصل ہے [1]

[1] البتہ فاضل محترم حافظ ابو عبید القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۴ھ) نے اپنے عظیم شاہکار "کتاب الاموال" کے ایک مستقل باب میں خمس کے تمام اصناف، احکام اور مصارف پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بحث کے بیشتر اجزاء شیعی مسائل سے اتفاق کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۳ تا ۳۴۹)

حج

شیعہ عقائد میں حج ' اسلام کا بہت بڑا ستون ہے۔ اس فریضہ کے ترک کرنے والے کو پاداش جرم میں یا تو یہودیوں کی طرح مرنا ہوگا، یا نصاریٰ کی سی موت قبول کرنا پڑے گی۔ اس سے روگردانی کفر کی حدوں کو پہنچا دیتی ہے، آیہ مبارکہ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ[۱] کا اشارہ اسی جانب ہے۔ حج ایک قسم کا مالی اور جسمانی جہاد ہے۔ بلکہ حج کو واقعی جہاد، اور جہاد کو حقیقی حج کہنا چاہیئے۔ ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو ان دونوں کی یگانگت سمجھ میں آجائے گی۔

حج کے اقسام

۱۔ **حج افراد:** حسب ارشاد: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ط
(جو لوگ پہنچنے کی قدرت رکھتے ہوں، خدا کے واسطے ان پر حج واجب ہے)۔ آل عمران۔ آیت: ۹۷

۱؎ استطاعت کے باوجود حج سے انکار کرنے والے کو خیال ہونا چاہیئے کہ اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت: ۹۷)

۲۔ **حج قران:** جس کی اس آیت میں تصریح ہے:
وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ط
خدا کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔ (البقرۃ: آیت ۱۹۶)

۳۔ **حج تمتع:** بمفاد آیہ کریمہ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔
(پس جو شخص حج تمتع کا عمرہ بجا لائے اسے جو قربانی میسر ہو، وہی پیش کردے۔" (البقرہ۔ آیت: ۱۹۶)

ان میں سے ہر ایک کے بڑے بڑے مباحث اور طول طویل احکام ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

ہم علمائے اہل سنت کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کے اکثر مسئلے ہمارے مسائل سے میل کھاتے ہیں۔ ہاں! کہیں کہیں اختلاف ہے مگر بہت کم۔ شیعہ حج کو کافی اہمیت دیتے ہیں اور ادائیگی فرض کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ راہیں طے کرنا پڑتی تھیں، قدم قدم پر ان لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا، جو ان کے خون کے پیاسے اور عزت وناموس کے دشمن تھے۔ ان دقتوں میں بھی اس مخلص گروہ نے خطروں سے بے پروا ہو کر لاکھوں کی

تعداد میں خانۂ کعبہ کا طواف کیا۔ جان و مال کے اندیشوں سے ہمتیں نہیں پست ہوئیں۔ واجبات کا احساس قدم بڑھاتا ہی رہا۔ حج کیا اور بڑی بڑی قیمتیں دے کر کیا۔

مگر افسوس اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ "شیعہ اسلام کی تخریب چاہتے ہیں"۔

★ جہاد

"جہاد" اسلام کی عالی شان عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دینِ حق نہ دنیا کے لئے وجہِ رحمت بنتا اور نہ انسانیت کے واسطے باعثِ برکت ثابت ہوتا۔

ظلم اور ظالموں کی مقاومت اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لئے جان و مال کو راہِ خدا میں قربان کر دینے کا نام جہاد ہے۔

مذہب شیعہ میں اس کی ۲ دو قسمیں ہیں:

☆ جہادِ اکبر

☆ جہادِ اصغر

اس باطنی دشمن کا مقابلہ جسے "نفس" کہتے ہیں، اور اس کے بُرے اثرات یعنی جہالت، بزدلی، جور و جفا اور رشک و نخوت وغیرہ سے برسرِ پیکار ہونا جہادِ اکبر ہے۔ "سب سے بڑا عدو، وہ نفس ہے جو تمھارے پہلو سے لگا ہوا ہے۔" اور جہادِ اصغر سے مراد اس ظاہری دشمن کی مدافعت ہے جسے عدل و انصاف، امن و شرافت اور دین و حقیقت سے بیر ہو۔

★ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ★

واجباتِ شرعیہ کا اہم ترین عنوان، فرائضِ عقل کا سب سے بڑا موضوع، حق و حقیقت کی طرف بُلانے کا مؤثر ذریعہ، کفر و باطل کو مٹانے کا کامیاب حربہ! جس قوم نے بھی اس مقدس قانون سے غفلت برتی، وہ آپ اپنے ہاتھوں برباد ہوئی، بلکہ ستمگاروں اور فریب کاروں کی جولاں گاہ بن کر رہ گئی۔

اسی لئے صاحبِ شریعت صلوٰۃ اللہ علیہ اور ہمارے آئمہ معصومین علیہم السلام نے اس ضمن میں بہت تاکید فرمائی ہے۔ جگہ جگہ اس کی پابندی کے فوائد اور نظر انداز کر دینے کے پُرہول عواقب سے آگاہ کیا ہے۔

آج ہم ان ارشادات کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، سامنے کی باتیں ہیں، عیاں راچہ بیاں!

بہرحال!— "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کو تو ہم چھوڑ ہی بیٹھے، مگر کاش یہ غفلت یہیں تک رہے۔ اس

منزل تک نہ پہنچنے پائے کہ "معروف" منکر اور "منکر" معروف بن جائے۔ رہبری کی رسم اُٹھ گئی۔ آگے خدا حافظ ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ اب تو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں خود رہنما نہ بھٹک جائیں ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۔ "بر و بحر میں فساد رونما ہو گیا"— نتیجہ تباہی اور مکمل تباہی!

"خداوندِ عالم بے عمل ناصحوں اور بدکردار واعظوں پر لعنت بھیجتا ہے۔"

شیعی مسلک میں مذکورہ عبادتیں "اُمہات العبادات" اساسی عبادتیں کہلاتی ہیں، جن کے سلسلے میں ہم نے صرف اشارے کئے ہیں تفصیل مطلوب ہو تو صدرِ اول سے لیکر عصرِ حاضر کے علما تک کی قابلِ قدر عظیم تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہمارے شاہکار مٹنے کے باوجود اب بھی لاکھوں مجلدات کی صورت میں فیض رساں ہیں۔

★ معاملات

معاملوں میں دو فریقوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک قبلوانے والا، اور دوسرا قبولنے والا (ایجاب و قبول شرط لازم ہے) معاملات کبھی تو صرف مالی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے خرید و فروخت، اجارہ و رہن قرض و ہبہ اور اُجرت وغیرہ۔

فقہ کی تمام کتابوں میں پوری شرح و بسط کے ساتھ ان کے جملہ متعلقات کا ذکر موجود ہے۔

معاملات کی دوسری شکل میں مال و دولت تو ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور اصل مقصد تدبیر منزل، افزائش نسل اور بقائے نوع ہوتا ہے۔ جیسے عقود زواج یعنی ازدواجی معاہدے۔ ہمارے ہاں ان معاہدوں کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عقد دوام

(۲) عقد منقطع

عقد دوام کہتے ہیں اُس نکاح کو جو مطلق و مرسل ہو۔ بالفاظ دیگر اس میں کسی وقت وغیرہ کی شرط موجود نہ ہو

بمفاد آیۂ مبارکہ وَانْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ [۱] اور عقد منقطع کا مفہوم یہ ہے کہ وہ متقید و موقت ہو۔ یعنی اس میں کسی مدت کا لحاظ رکھا جائے۔

نکاح کی پہلی قسم سے تو تمام مسلمان متفق ہیں مگر دُوسری قسم کو جسے حسب فرمان خداوند کریم فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ [۲] نکاح متعہ بھی کہا جاتا ہے سوائے شیعوں کے اور کوئی جائز نہیں سمجھتا۔ صرف شیعہ ہی اس کی مشروعیت کے قائل ہیں۔ نیز عہد صحابہ سے لے کر اب تک یہ مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے چنانچہ مُعاملے کی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کرتے چلیں۔

★ بحث متعہ

واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جسے ذرا بھی مذہب اسلام کو سمجھنے کا موقع مِلا ہے اور جس نے بھی دینی قوانین کے مطالعہ میں زندگی کے کچھ لمحے صرف کئے ہیں، وہ ان

[۱] سورۂ نور۔ آیت: ۳۲

[۲] سورۂ نساء۔ آیت: ۲۴

متعہ کے بارے میں وضاحت اصحابوں نے بھی منع کیا احادیث سے ثابت ہے۔ متعہ کے بارے میں آیت بھی دیکھئے

حقیقت سے قطعاً انکار نہیں کر سکتا کہ متعہ کے معنیٰ وہ عقد ہے جو ایک بندھے ٹکے وقت کے لئے ہو۔

خود پیغمبر اکرمؐ نے اس قسم کے عقد کو رائج کیا مُباح فرمایا۔ اور حیاتِ رسولؐ میں بڑے بڑے صحابہ اس پر عمل پیرا ہوئے۔ نیز آں حضرتؐ کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ کرام قانون کی اس شق سے جی بھر کر متمتع ہوتے رہے۔

چنانچہ عبداللہ بن عباس، جابر ابن عبداللہ انصاریؓ عمران ابن الحصینؓ ابن مسعود اور ابی ابن کعب وغیرہم یہ تمام اعاظم و مشاہیر متعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے، اور آیتِ متعہ کو اس طرح پڑھتے تھے:۔

"فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى"۔

لیکن ہماری رائے میں یہ یقین کرنا درست نہ ہوگا کہ یہ حضرات اللہ کے کلام میں کسی نقص و تحریف کے قائل تھے (معاذ اللہ) نہیں۔ بلکہ غالباً سخن شناس ہونے کی وجہ سے تفسیر کے طور پر اس جزو کے ذریعے آیت کا منشاء بیان کرتے ہوں گے۔ چونکہ عرصہ دراز تک یہ بزرگ شمع نبوت کا طواف کرتے رہے۔ انھیں معارفِ قرآنی کو زبانِ رسالتؐ سے سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

لہٰذا جب لوگ ان سے دریافت کرتے ہوں گے تو اس آیت کے سلسلے میں ختمی مرتبتؐ سے حاصل کردہ مفہوم کو ظاہر کر دینے میں انھیں کوئی تامل نہ ہوتا ہوگا۔

حالانکہ ابن جریر نے اپنی "تفسیر کبیر" میں جو روایتیں درج کی ہیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى والا ٹکڑا آیت کا حصہ ہے۔ چنانچہ موصوف ابونضرہ کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ میں نے اس آیت کو ابن عباسؓ کے سامنے پڑھا تو آپ نے فرمایا اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ میں نے عرض کی کہ "میں تو یوں نہیں پڑھتا" — اس پر ابن عباسؓ نے تین مرتبہ فرمایا: "بخدا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے!" — لیکن یہاں بھی ہم عرض کریں گے کہ رئیس ملت حضرت ابن عباسؓ کا مقام ان نقائص سے بہت بلند ہے یہ روایت اگر صحیح ہے تو غالباً رسولؐ کے اس جلیل القدر صحابی کا مقصود یہ ہوگا کہ پروردگارِ عالم نے اس کی تفسیر یوں نازل فرمائی ہے۔

بہر حال اجماع و یقین۔ متعہ کی صحت و مشروعیت کا بیّن ثبوت ہیں۔ اب رہا مخالف نظریہ رکھنے والوں کا ادعا تو اس میں وزن ہی کیا۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ "یہ قانون

نافذ ہو کر منسوخ ہوگیا" — حالانکہ نقل کے طریقے ہیں
جو اختلافات نمایاں ہیں وہ قطع و یقین تو درکنار ظن و تخمین
کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ دیکھئے بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ حکم
قطعی کی تنسیخ کے لئے دلیلِ قطعی کا ہونا ضروری ہے اور ان
حضرات کا ارشاد ہے کہ تنسیخ سنّت کے طریقہ سے عمل میں
آئی۔ سرکارِ رسالتؐ نے مُباح فرما کر حرام قرار دے دیا۔ بعض
فرماتے ہیں کہ نہیں، کتابِ خدا کے ذریعہ حرمت کے پہرے
بیٹھ گئے۔ نیز اس منزل پر بھی اتحادِ فکر عنقا ہے، کیونکہ
ایک گروہ آیتِ طلاق کو ناسخ سمجھتا ہے[1] اور دُوسرا آیۂ
مواریث کو۔ اب ان پریشان خیالیوں کی جو قیمت ہو سکتی
ہے وہ ظاہر ہے۔ بنابریں یہاں مزید خامہ فرسائی کی ضرورت
نہیں۔ آگے چل کر قدرے توضیح کی جائے گی۔

ہاں! اور اکثر بزرگ اس آیت سے متعہ پر خطِ نسخ
پھیرتے ہیں۔

اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ[2]

آیت میں حلّت کے دو سبب بتائے گئے ہیں:

[1] وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ۔ (سورۂ نساء۔ آیت: ۱۲)
[2] سورۂ مومنون۔ آیت: ۶ و سورۂ معارج۔ آیت: ۳۰

۱۔ زوجیت
۲۔ ملکیت

چنانچہ اس موقعہ پر سیّد آلوسی ترقیم فرماتے ہیں کہ:

"شیعہ حضرات ممتوعہ کو مملوکہ (کنیز) قرار
نہیں دے سکتے۔ یہ تو ایک کُھلی ہُوئی بات
ہے، اور زوجہ کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس میں
زوجیت کے شرائط یعنی میراث، عدّہ اور
نفقہ و طلاق کا فقدان ہے"

غور فرمایئے، دلیل میں کتنا زبردست مغالطہ ہے۔ اب ذرا
تجزیہ کیجئے۔ پہلی چیز میراث۔ اگر زوجیت کے لئے اس
شرط کو عمومی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ایسا ہوتا
ہے کہ زوجہ ورثہ پاتی ہے تب تو ٹھیک ہے لیکن غالباً سیّد
صاحب کا یہ منشا نہیں، اور اگر یہ مُراد ہے کہ میراث شرطِ
لازم و دائم ہے، یعنی بہر صورت ورثہ ملنا چاہیئے تو یہ قطعی
طور پر خلافِ آئین ہے۔ کیونکہ شریعت میں اکثر ایسے
مواقع آتے ہیں جہاں میراث ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً زوجہ
کافرہ اور قاتلہ کو ورثہ نہیں ملتا۔ نیز ایسی عورت جو کسی
مریض کے عقد میں چلی جائے اور دخول سے پہلے اس کے

شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ بھی محروم ہو جاتی ہے نیز برخلاف اس کے اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اسی مرض کے عالم میں اس کا انتقال ہو جائے تو عدہ کی مدت گزارنے کے باوجود دورانِ سال میں مطلقہ ورثے کی حقدار ہوگی۔ غرضیکہ دونوں رُخ سامنے ہیں، اور صاف ظاہر ہے کہ ارث کو "لازمۂ زوجیت" نہیں قرار دیا جا سکتا۔

رہا عدت کا لزوم تو امامیہ مذہب میں بالاتفاق ثابت ہے بلکہ جو بھی مشروعیتِ متعہ کا قائل ہے وہ عدت کو واجب قرار دیتا ہے۔ تیسری چیز نفقہ ہے۔ اسے بھی شرطِ زوجیت نہیں بنایا جا سکتا۔ اطمینان کے لئے "زن ناشزہ" کے احکام کو دیکھ لیجئے کہ وہ زوجیت میں ہوتی ہے مگر بالاتفاق اس کے نفقہ کو کوئی واجب نہیں سمجھتا۔

باقی رہا طلاق کا معاملہ۔ تو اس سلسلے میں مُدت کا بخش دینا کافی ہے۔

دُوسری بات یہ کہ ازواج کی آیت سے متعہ کی منسوخی محال ہے۔ کیونکہ آیتِ متعہ سُورۂ نساء میں ہے، جو مدنی ہے۔ اور آیۂ ازواج سُورۂ مومنین و معارج میں ہے اور یہ

دونوں مکی ہیں۔ بنابریں نسخ ثابت ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ منسوخ پر ناسخ کا تقدم غیر ممکن ہے۔

تیسرے یہ کہ اکابر اہلِ سنت بیان فرماتے ہیں کہ آیت متعہ منسوخ نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو کشاف "زمخشری" ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ متعہ کی آیت "محکمات" میں سے ہے دُوسروں نے روایت کی ہے کہ حکم ابن عتیبہ سے دریافت کیا گیا کہ آیتِ متعہ کیا منسوخ ہو گئی ہے؟ جواب ملا نہیں!

غرضیکہ پہلے تو جمہورِ اسلام نے اس کی مشروعیت کا اعتراف کیا لیکن بعد میں منسوخ ہونے کے دعوے کرنے لگے، اور طریقِ نسخ میں جو قیاس آرائیاں فرمائی ہیں، وہ بھی قابلِ دید و شنید ہیں۔ کبھی تو آیت کو آیت کے ذریعہ منسوخ فرمانے کی کوششیں ہوئیں (ضعفِ دلیل کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے) گاہے آیت کو حدیث سے ختم کرنے کی سعی فرمائی گئی۔ اس ضمن میں صحیح بخاری و مُسلم کی اس روایت سے استشہاد کیا جاتا ہے کہ فتح مکہ، فتح خیبر یا غزوۂ اوطاس میں آں حضرتؐ نے اسے ممنوع قرار دے دیا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ معاملہ

آماجگاہِ اختلاف بنتا ہے۔ نہ جانے کتنے رنگ چڑھتے ہیں
اور کیا کیا پینترے بدلے جاتے ہیں۔

چنانچہ قاضی عیاض کی زبانی بیان کیا جاتا ہے:

"بعض علماء کا ارشاد ہے کہ نکاحِ متعہ دو دفعہ
حرام، مباح اور منسوخ ہوا۔"

لیکن آنکھ بھر کر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان حضرات نے
اپنی علمی دنیا میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حجۃ الوداع سنہ ۱۰ھ میں
منسوخ کیا گیا۔ دوسرے مصنفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہیں
غزوۂ تبوک سنہ ۹ھ میں تنسیخ ہوئی۔ کچھ قلمکاروں نے غزوۂ
اوطاس اور غزوۂ حنین شوال سنہ ۸ھ کا حوالہ دیا ہے مگر
ایک اور گروہ فتحِ مکہ رمضان سنہ ۸ھ کا واقعہ بتاتا ہے۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آں حضرتؐ نے فتحِ مکہ کے
موقع پر جائز قرار دیا تھا، اور پھر چند دن بعد وہیں اس
کی حرمت کا حکم صادر فرما دیا۔ البتہ شہرت اور غالب رائے
یہ ہے کہ متعہ کی تنسیخ غزوۂ خیبر یا عمرۃ القضاء سنہ ۷ھ میں
عمل میں آئی۔

بہرکیف! اس مختصر خیال سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے

کہ دو یا تین دفعہ نہیں (جیسا کہ نووی شارحِ مسلم نے
ترقیم فرمایا ہے) بلکہ پانچ چھ مرتبہ حرام حلال کا کھیل ہوتا
رہا، کیوں؟ علمائے اسلام! بازی بازی با دینِ خدا
ہم بازی؟" یہ کیا اندھیر ہے؟ سچ کہنا اس درجہ فکری
انتشار کے ہوتے ہوئے تمہارے ادعائے نسخ میں کوئی
جان باقی رہ جاتی ہے؟

یہ ناقابلِ انکار حقائق ہیں کہ:

(۱) قرآنی احکام اخبار آحاد سے منسوخ نہیں ہو سکتے۔

(۲) نسخ کی دلیلیں خود سوادِ اعظم کی روایات عدمِ نسخ
سے متصادم ہوتی ہیں۔

(۳) صحیح بخاری کی روایت ہے "ابو رجاء، عمران بن حصین
ناقل ہیں کہ آیۂ متعہ قرآن میں موجود ہے۔ رسولؐ کے
ہوتے ہوئے ہم نے اس پر عمل کیا۔

پھر نہ قرآن نے اس کی حرمت کا حکم دیا، اور نہ آخر وقت
تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی
ہاں! ایک شخص نے من مانی کی۔ جو چاہا کہہ دیا۔ محمد کا قول ہے
کہ اس حرکت کو حضرتِ عمر کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔"

نیز صحیح مسلم میں عطا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"ایک مرتبہ جابر ابن عبد اللہ انصاری عمرہ
بجا لانے کے لئے آئے تو ہم سب ان کی
قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان سے
مختلف مسائل پوچھے۔ چنانچہ متعہ کے متعلق
بھی دریافت کیا۔ جابر نے کہا۔ ہاں! عہدِ
رسالتؐ میں ہم نے متعہ کیا، اور ابوبکرؓ و عمرؓ
کے زمانے میں بھی!"

مُسلم کی ایک اور روایت ہے، اور حضرت جابر ہی کی زبانی، فرماتے ہیں:

"دورِ نبوی میں تو ہم ایک مُٹھی کھجور، اور
مُٹھی بھر ستو دے کر مُتعہ کر لیا کرتے تھے"

علاوہ ازیں صحیح مُسلم کے اوراق میں یہ بھی موجود ہے۔

"ابونضرہ بیان کرتے ہیں کہ میں جابر ابنِ عبداللہ انصاری کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں ایک اور آدمی آگیا، اور آتے ہی کہنے لگا، متعوں کے بارے میں تو ابنِ عباس اور ابن زبیر کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے؟ جابر نے فرمایا:

"رسالت مآبؐ کی موجودگی میں تو ہم ان پر

عملِ پیرا تھے، لیکن بعد میں عمرؓ نے ممانعت
کر دی۔ اِس لئے پھر نہ کر سکے"۔

جی ہاں! اِس لئے پھر نہ کر سکے کہ حضرت عمرؓ متعہ کرنے والوں کو سنگسار کروا دیتے تھے۔

واقعہ یہ کہ صحیح مُسلم کے اس حصّے کو اگر غور سے دیکھا جائے تو تضاد بیانی کے ایسے ایسے عجوبے نظر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ادھر مثبت حدیثیں ادھر منفی روایتیں۔ یہاں نسخ کے دعوے وہاں عدمِ نسخ کے ثبوت، اور سُنیئے! جہنی فرماتے ہیں کہ:

"فتحِ مکّہ کے موقع پر خود آنحضرتؐ نے ہمیں
متعہ کا حکم دیا تھا، لیکن ہم وہاں سے نکلنے
بھی نہ پائے تھے کہ سرکارِ رسالتؐ نے اس
کی ممانعت فرما دی"۔

تنسیخ کی نسبت کبھی پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف گاہ حضرت عمرؓ کی جانب، مزید برایں عہدِ نبویؐ اور پہلی خلافت کے زمانے میں عقدِ متعہ رائج تھا، اور یہ بھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے متعدد مواقع پر جناب ابنِ عباس کو متعہ کے بارے میں

گفتگو کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے
اپنی رائے بدل دی۔

مگر اس کے ساتھ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ ابنِ زبیر
نے ایک مرتبہ مکّہ میں اُٹھ کر فرمایا تھا:

"کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ خداوندِ عالم نے
جس طرح ان کی بصارت چھینی، اسی طرح
ان کی بصیرت بھی سلب کر لی۔ وہ متعہ کا
فتویٰ دیتے پھرتے ہیں!"

(یہ اشارہ ابنِ عبّاس کی طرف تھا، جو نابینا ہو گئے تھے) اس پر
ابنِ عبّاس نے آواز لگائی۔ ہاں!

"قسم کھا کر کہتا ہوں کہ متعہ امام المتقینؑ کے
زمانے تک رائج تھا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبداللہ ابنِ عبّاس نے کبھی بھی
اپنی رائے نہیں بدلی، بلکہ وہ زندگی بھر، تا دورِ خلافت
ابنِ زبیر اپنے فتوے پر قائم رہے۔

اور سب سے زیادہ پُرلطف بات تو یہ ہے، کہ
امتناعی حکم کو جناب امیر علیہ السّلام سے بھی منسوب

کیا گیا ہے۔ حالانکہ عقدِ متعہ کو جائز قرار دینا اہلِ بیت
علیہم السّلام کا امتیازی مسلک ہے۔ پھر خصوصیت سے
اس ضمن میں امیر المومنین علیہ السّلام کا یہ ارشاد کہ:

"اگر عمر نے متعہ کو ممنوع نہ کیا ہوتا تو گنتی
کے (یا گنے گذرے) کچھ لوگ ہی زنا کے
مرتکب ہوتے"

ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں بھی
اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلے میں باوثوق ذرائع
سے امام جعفر صادق علیہ السّلام کا یہ قول ملتا ہے کہ:

"تین مسئلوں میں کسی کی پروا نہیں کرتا
متعہ الحج، متعہ النّساء، اور مسح بر کفش"

بہر طور فنّی قاعدوں اور اصولِ فقہ کے مقررہ ضوابط کی
رُو سے یہ طے شدہ بات ہے کہ ادھر روایتوں میں تضاد
پیدا ہوا، اور ادھر وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہوئیں کیونکہ
مشکوک روایتیں قابلِ انکار اور ان کے مقابلے میں محکم
حدیثیں لائقِ عمل ہوتی ہیں۔

نیز جب کہ علمائے اسلام کے متفقہ فیصلے اور فقہی
تکنیک کے مطابق متعہ کی مشروعیت اور اس کا جواز ثابت

ہے تو آج بھی اس کی اباحت کا اقرار کرنا پڑے گا۔

★ مسئلہ کا واحد حل ——

اب اگر ہم حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں، معاملہ کی پوری چھان بین کریں اور اس کی تمام کڑیوں کو ملا کر صحیح نتیجہ نکالنا چاہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عمر نے اپنے دورِ حکومت میں کسی خاص مصلحت کے پیشِ نظر اپنی رائے سے متعہ کو ممنوع قرار دے دیا تھا، لیکن یہ ممانعت قطعی طور پر سماجی حالات اور وقتی تقاضوں پر مبنی تھی۔ دین، مذہب کا اس سے کوئی سروکار ممکن نہیں چنانچہ تواتر کے ساتھ آپ کا یہ قول نقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ:

"رسولؐ کے زمانے میں دو متعہ جائز تھے، مگر میں انھیں حرام قرار دیتا ہوں" —— اور خلاف ورزی پر سزا دوں گا۔"

یہاں غور طلب چیز یہ ہے کہ خلیفۂ ثانی نے حرمت یا نسخ کے حکم کو سرکارِ رسالتؐ کی جانب نہیں منسوب کیا۔ بلکہ خود اپنی ذات کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ نیز سزا کا تعلق بھی اپنے ہی سے رکھا۔ خدا سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے

ورنہ پھر ان خطوط پر سوچنا پڑے گا کہ حضرت عمر جیسی شخصیت اور دینِ الٰہی میں بے محابانہ "کتر بیونت"! لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں آپ کے مقام کو دیکھتے ہوئے اس اندازِ فکر کا اختیار کرنا کس قدر مشکل ہے۔

کیا حضرت عمر یہ نہیں جانتے تھے کہ محمدؐ کا حلال قیامت تک حلال، اور حضورؐ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ تا حشر حرام رہیں گی؟

خداوندِ عالم خود اپنے حبیبؐ سے فرماتا ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝

"اگر رسول ہمارے متعلق کچھ باتیں گھڑ لیتا تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر گلا کاٹے بغیر نہ چھوڑتے، اور پھر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ تم میں سے کوئی آکر بچا لیتا۔"

(الحاقۃ۔ آیت: ۴۴ تا ۴۷)

بہر طور یہی بہتر تھا کہ حضرت عمر کے امتناعی حکم کو مذہبی حیثیت دینے کے بجائے اسے سیاسی یا سماجی قدغن قرار دیا جاتا مگر کیا کہا جائے کہ آپ کے بعض معاصرین نیز بعد کے کچھ

سادہ لوح محدثوں نے اس باریک نکتہ پر غور نہیں کیا، اور فرطِ عقیدت میں اپنے قائد کے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے نسخ کی دلیل تراشی اور اسے آنحضرتؐ کی جانب منسوب کر دیا۔ نتیجۃً ان کے دبستانِ فکر میں وہ خلفشار پیدا ہوا کہ پناہ بخدا!

فی الواقع یہ حضرات اگر وہ موقف اختیار کرتے جس کی ہم نے نشاندہی کی ہے، تو اتنی اُلجھنوں میں نہ پڑتے۔

صحیح مسلم کے حوالے سے جابر ابن عبداللہ انصاری کی روایت کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ کہ:

"دورِ نبویؐ اور عہدِ ابوبکر میں تو ہم ایک مٹھی کھجور اور مٹھی بھر ستّو دے کر متعہ کر لیا کرتے تھے۔ لیکن عمرو بن حریث کے سلسلے میں عمر نے ممانعت کر دی۔"

یہ بڑا واضح ثبوت ہے کہ ایک خاص واقعہ کے سلسلے میں حضرت عمر نے اپنی ذاتی ناپسندیدگی کے باعث اسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ ناگوار معاملہ پیش ہوا ہو۔ اور آپ نے اپنی تیز مزاجی سے مجبور ہو کر ممانعت کا حکم صادر کر دیا ہو۔

ورنہ متعہ کے سلسلہ میں نصِ قرآنی، سنتِ رسولؐ، عملِ صحابہ نیز حضرت ابوبکر کے زمانے کا تعامل اور خود حضرت عمر کے آغازِ خلافت تک متعہ کا رواج، یہ سب ایسے حقائق ہیں جو بحث و تمحیص سے بالاتر ہیں۔ تاریخ و حدیث کی کتابیں شاہد ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں بڑے بڑے صحابی اور خاندانِ قریش کے مشہور افراد دھڑلے سے متعہ کیا کرتے تھے اور اور اس قسم کے عقد سے ان کی نسل چلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔

چنانچہ سوادِ اعظم کے معتبر و مستند عالم راغب اصفہانی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "المحاضرات" میں ترقیم فرماتے ہیں کہ متعہ کو حلال کہنے کے سلسلے میں ایک مرتبہ عبداللہ ابنِ زبیر نے جناب عبداللہ ابنِ عباس کو طعنہ دیا، اس پر ابنِ عباس نے فرمایا۔ "اچھا، ذرا اپنی والدہ سے تو پوچھو، کہ ان میں اور تمہارے والدِ بزرگوار میں جو برابر کی آگ لگی ہوئی تھی" ـــ خیریت سے وہ لگی کیسے؟

عبداللہ ابنِ زبیر نے جا کر ماں سے پوچھا۔ "بتائیے، یہ کیا قصّہ ہے؟"

انھوں نے صاف صاف کہہ دیا، کہ "بیٹا! تم متعہ سے پیدا ہوئے ہو!"

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عبداللہ کی والدہ جناب
اسماء ذات النطاقین حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی، اور
اُمّ المومنین جناب عائشہ کی بہن تھیں، جنھیں صحابیِ رسولؐ
زبیر ابن العوام نے متعہ کے ذریعہ اپنی جیون ساتھی بنایا تھا۔
انکار کرنے والے، دیکھیے اب کیا فرماتے ہیں؟

اِس واقعہ کے بعد راغب اصفہانی نے ایک اور روایت
لکھی ہے اور وہ یہ کہ بصرہ کے کسی بزرگؒ نے یحییٰ ابن اکثم سے
دریافت کیا کہ جوازِ متعہ کے سلسلہ میں جناب کس کی پیروی
فرماتے ہیں؟ — یحییٰ نے جواب دیا "عمر ابن الخطاب کی!" سائل
نے کہا "یہ کیسے؟" — "وہ تو اس معاملے میں بڑے ہی سخت گیر تھے"
یحییٰ نے کہا۔ ہاں! مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرتِ عمر
نے ایک دفعہ برسرِ منبر اعلان فرمایا تھا کہ لوگو! اللہ اور
اس کے رسولؐ نے دو متعہ حلال کئے تھے مگر میں انھیں
حرام قرار دیتا ہوں۔ نیز خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا
دُوں گا" — لہٰذا ہم ان کی گواہی کو تو قابلِ قبول سمجھتے ہیں،
لیکن موصوف کا حکم ہمارے نزدیک لائقِ تعمیل نہیں"۔
عبداللہ ابنِ عمر کے بیان کا بھی تقریباً یہی مفہوم ہے

البتہ اِس ضمن میں خلیفہ ثانی کا جو جملہ شہرتِ عام رکھتا ہے
اس کے الفاظ یہ ہیں:

"مُتعتانِ کانتا علیٰ عهدِ رسولِ اللهِ وَ
اَنا اُحرِّمُهُما"۔

"عہدِ رسالتؐ میں دو متعہ تھے اور میں انھیں
حرام کرتا ہوں!"

یہاں مکرّر عرض ہے کہ اگر حضرتِ عمر کی ممانعت اسی قسم
کی تھی جس پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں، تب تو معاملہ قدرے
آسان ہے ورنہ سخت مشکل!

اس منزل پر ہمیں پانچویں صدی ہجری کے محقق
کامل محمدؐ ابن ادریس حلّی کا بھی ایک شہ پارہ یاد آگیا، جسے
مطابقت اور توضیحِ مزید کے خیال سے نقل کیا جاتا ہے
علامہ ممدوح جنھیں ہمارے علماءِ متقدمین میں بہت بڑا
درجہ حاصل ہے۔ اپنی بلند پایہ تصنیف "السرائر" میں
ارشاد فرماتے ہیں:-

"نکاحِ موقت شریعتِ اسلامی میں جائز
ہے اور کتابِ خدا، نیز مسلمانوں کے
مسلسل اتفاق سے از روئے سنت بھی اس

کی مشروعیت ثابت ہے۔ البتہ کچھ لوگوں
نے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر اس
کی درستی محتاجِ دلیل ہے۔ علاوہ ازیں صحیح
دلائل سے یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ ہر
سُود مند کام جس سے حال و استقبال میں کسی
نقصان کا اندیشہ نہ ہو وہ عقلی طور پر مباح
ہے۔ اور نکاحِ متعہ میں یہ وصف موجود ہے،
بنا بریں عقلاً اس کے جواز کا اقرار ضروری ہے
اب اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ مستقبل میں
اس کے ضرر رساں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے
جب کہ اس بارے میں مخالف آرا بھی موجود
ہیں تو اس کا جواب یہ کہ بارِ ثبوت اس پر ہے
جو امکانِ ضرر کا مدعی ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کا
اجماع بھی اس کا واضح ثبوت ہے اور یہ
حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں کہ
عقدِ متعہ آں حضرتؐ کے زمانے میں مُباح
تھا، مگر بعد میں حرمت و تنسیخ کے دعوے
ہونے لگے جو ثابت نہیں کیے جا سکے، اور

اباحت متفقہ طور پر ناقابلِ انکار، لہٰذا مدعیان
نسخ و تحریم کی جانب سے کوئی تسلی بخش جواب
ملنا چاہیے۔ اب اگر وہ ان روایات کو دہراتے
ہیں جن میں حکمِ امتناعی پیغمبرِ اکرمؐ کی جانب
منسوب ہے تو پھر انھیں یہ سننا پڑے گا کہ
اس قماش کی تمام حدیثیں (بشرطیکہ صحیح بھی
ہوں) اخبارِ آحاد ہیں جو شریعت کی دُنیا
میں علم و عمل کا موجب قرار نہیں پا سکتیں،
اور نہ ایسی روایتوں کی بنیاد پر حقائقِ ثابتہ
سے رُوگردانی جائز ہے۔"

محرمات کے تذکرے کے بعد خداوندِ عالم اپنی کتابِ اقدس
میں ارشاد فرماتا ہے:

وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم
مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ
فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا

تَرَاضَیْتُمْ بِہٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِیْضَۃِ ؎1

آیۂ وافی ھدایہ میں بحث طلب لفظ اِسْتَمْتَعْتُمْ ہے جس کے بس دو معنی ہیں:

(۱) انتفاع (۲) التذاذ

دُوسرا مفہوم لغوی ہے اور پہلا اصطلاحی، جس سے مُراد وہ موقت اور مخصوص عقد ہے جو مقصودِ شرع ہے۔

اب یہاں لغوی مفہوم تو قابلِ اعتنا رہنے سے رہا کیونکہ اصُولِ فقہ کے مطابق مسلّمہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر قرآن کے کسی لفظ سے دو مطلب نکلتے ہوں، ایک لغوی اور دُوسرا وہ جسے شریعت نے رائج کیا ہو۔ تو ایسی صُورت میں لغت پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ شریعت کی بات ماننا پڑیگی اور یہی وجہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام اور حج کے سِلسلہ میں کسی فرہنگ پر نہیں بلکہ عرف شرع پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

؎1 ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمھارے لئے جائز ہیں مگر شرط یہ کہ بدکاری نہیں بلکہ عفت اخلاق کی غرض سے زرِ مہر دیکر نکاح کرنا چاہو۔ ہاں جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہو انھیں معینہ مہر ادا کردو۔ اور مہر کے بارے میں، اگر آپس میں مفاہمت کرلو تو کوئی حرج نہیں۔ (النساء۔ آیت: ۲۴)

نیز اس سے پہلے صراحت ہوچکی ہے کہ صحابہ و تابعین کا ایک مشہور و معروف گروہ اباحتِ متعہ کا قائل تھا جیسے امیر المومنین علی ابن ابی طالب، عبداللہ ابن عباس جو اس موضوع پر ابنِ زبیر سے مناظرے کرتے رہے اور ان مناظروں کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ نہ صرف زبان زد عام ہوئے بلکہ اس زمانے کے شعراء نے بھی طبع آزمائی کی چنانچہ ایک سخنور کہتا ہے ؎

اَقُوْلُ لِلشَّیْخِ لَمَّا طَالَ مَجْلِسُہٗ،
یَا شَیْخُ ھَلْ لَکَ فِیْ فَتْوَی ابْنِ عَبَّاسٍ

نیز عبداللہ ابن مسعود، مجاہد، عطا، جابر ابن عبداللہ انصاری سلمہ ابن الاکوع، ابو سعید خدری، مغیرہ ابن شعبہ، سعید ابن جبیر اور ابن جریح وغیرہم یہ سب کے سب جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ لہٰذا عقدِ منقطع کے خلاف جانیوالوں کا اِدعا صحیح نہیں"۔

اربابِ بصیرت ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اِس بحث میں کتنی متانت پختگی اور قوّت پائی جاتی ہے، خیر! یہاں تک تو اِس موضوع پر صرف دینی اور تاریخی حیثیت

سے روشنی ڈالی گئی۔ اب آئیے ذرا اخلاقی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیتے چلیں۔

اسلام دنیا کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ توحید کے رسیلے نغمے امرت بن کر برسے، جن سے غم نصیب انسانیت کو بے پایاں سکون حاصل ہوا جس طرح یہ مانی ہوئی بات ہے اسی طرح اس حقیقت کا اعتراف بھی لازم کہ دین مبین ہر زمانے کا ساتھ دیتا ہے۔ ہر وقت کے تقاضے پورے کرتا ہے نیز عالمِ بشری کی جملہ ضروریات دُنیوی و اُخروی کا تکفیل اور ہر گونہ فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ آئینِ رحمت میں زحمت کا سوال ہی نہیں۔ آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک! ایک دُنیا کیا تمام عالموں کے لئے برکت۔ اسی لئے تو یہ کامل ترین مذہب اور آخری شریعت بننے کا حقدار ٹھہرا۔ کون نہیں جانتا کہ قانونِ الٰہی نے اِنسانی مُعاشرے کو ایسا سنوارا کہ کسی اور دستور کی حاجت نہ رہی۔

اِتنا جاننے کے بعد اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افرادِ انسانی کو کبھی سفر کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ نفی میں جواب ممکن نہیں، کیونکہ مشاہدہ بتلاتا ہے کہ لوگ عموماً سفر کرتے ہیں۔ بلکہ غائر نگاہ سے دیکھا جائے

تو معلوم ہوگا کہ جب سے اِنسان نے ہوش سنبھالا اور اپنے شعور سے کام لینا شروع کیا، اُس وقت سے اس نے اپنی معاش کے لئے جو وسیلے اختیار کئے ان میں سفر کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مختلف ضرورتیں آدمی کو راہِ غربت طے کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً تجارت، ملازمت تحصیلِ علم یا جنگ اور دفاع وغیرہ اور یہ بھی مُسلّم کہ مذکورہ اغراض کے سلسلہ میں نوجوان یا کم از کم توانا افراد ہی دُور دراز ملکوں کا عزم کر سکتے ہیں۔

اور کسے معلوم نہیں کہ اس حکیم مطلق نے بقائے نسل اور حفظِ نوع کے لئے ہیکلِ انسانی میں جنسی خواہش بھی ودیعت فرمائی ہے، اور یہ بھی ظاہر کہ ایک مُسافر آدمی عقدِ دائم کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہوتا ہے، نیز لونڈیوں، باندیوں کی فراہمی بھی آسان نہیں (آج کل تو ناممکن ہے) لہٰذا اِن حالات میں اس مدّت کے بچھڑے ہوئے پردیسی کو کیا کرنا چاہیئے۔ جو اتفاق سے نوعمر بھی ہو اور مجبور بھی بس دو ہی صورتیں ممکن ہیں ــ ضبطِ نفس، یا بدکاری۔

۱- مگر ضبطِ نفس میں نہ صرف مہلک قسم کی مختلف بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے بلکہ نسل کا منقطع ہو جانا

بھی کچھ بعید نہیں اور یہ منافی حکمت ہے۔ شریعتِ اسلامی بڑی آسان اور آرام دہ شریعت ہے ؎

"سہولت چاہیئے ہے شدّت نہیں مقصود
دین میں کسی پہلو تکلیف نہیں!" (قرآن)

۲۔ جنسی بے راہ روی سے خدا محفوظ رکھے۔ آج دُنیا کے بیشتر حصّے اس کا خمیازہ بُھگت رہے ہیں۔

سچی بات یہ ہے اگر مُسلمان صحیح طریقہ سے شرعی قوانین پر عمل پیرا ہو جائیں تو حسبِ وعدۂ خداوندی یہ کائنات ان کے لئے سراپا رحمت بن جائے اور اچھے دن پھر واپس آ جائیں۔

متعہ بھی دینِ اسلام کا ایک سود مند قانون ہے اگر مُسلمان اس کے شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے یعنی عقد عدہ اور محافظتِ نسل پر نظر رکھ کر عمل پیرا ہوتے تو بڑی حد تک بدکاریوں کا انسداد ہو جاتا۔ عزّتیں محفوظ رہتیں، حلال نسلیں بڑھتیں، دُنیا ناجائز بچّوں سے نجات پاتی اور اخلاقی قدروں کو فروغ حاصل ہوتا۔

رئیسِ ملّت حضرت عبداللہ ابنِ عبّاس کے اس جاودانی قول کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں:

"متعہ ایک رحمت تھا جس سے خداوندِ عالم نے اُمّتِ محمّدیہ کو نوازا تھا۔ اور اگر اس سے منع نہ کیا جاتا تو سوائے گئے گزرے لوگوں کے، اور کوئی زنا کا مرتکب نہ ہوتا۔"

(ملاحظہ ہو نہایہ ابن اثیر اور الفائق زمخشری)

ابنِ عبّاس کے اس پُرمغز بیان میں ان کے جلیل القدر استاد اور مُربّیِ حکیمِ الٰہی امیرالمومنین علیہ السّلام کی تعلیم کے اثرات جھلک رہے ہیں اور حقیقت یہ کہ عالمِ اسلامی نے اس نیکی سے منہ موڑ کر اپنی بدنصیبی کا سامنا کیا ہے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

★ طلاق

گزشتہ مُباحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ تزویج کی حقیقت وہ خاص ربط ہے جو مرد اور عورت کے درمیان قائم ہوتا ہے، اور دو مختلف افراد کو ایک دوسرے کا قرین اور کفو بنا دیتا ہے۔ عائلی نظام میں زن و شوہر کے توافق و اشتراک کو دونوں آنکھوں اور ہاتھوں سے

تشبیہ دینا چاہیئے۔ ایک دوسرے کے ساتھی، ایک دوسرے کے ساجھی۔

یہ امر اپنی جگہ کس قدر لائق توجہ ہے کہ وہ دو ہستیاں جو آپس میں بالکل غیر ہوتی ہیں "عقدِ زواج" انھیں اس مضبوطی سے ملا دیتا ہے، اس شدت سے ان میں اتحاد پیدا کرتا ہے کہ اس سے زیادہ مستحکم علاقہ یگانگت کا تصور ناممکن ہے بلکہ اس خصوصی وابستگی اور اس کے گہرے اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے کلامِ الٰہی کی اس آیت کے علاوہ اور کوئی مناسب و موزوں عبارت سمجھ میں نہیں آتی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ [1]

"وہ تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو!"

واقعہ یہ ہے کہ اس آیہ وافی ھدایہ میں اس قدر معجزانہ محاسن اور محیر العقول نکات پنہاں ہیں، جن کے اعتراف سے قلم قاصر ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس رشتہ کا قدرتی تقاضہ یہ ہونا چاہئے کہ مرتے دم تک نہ ٹوٹے بلکہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے مگر یہ کہ کوئی ایسی شکل نکل آئے جس کے باعث مشترکہ

[1] البقرہ - آیت: ۱۲۷

زندگی بسر کرنے کا مذکورہ معاہدہ ختم ہو جائے۔

بسا اوقات کچھ ایسے ناگزیر حالات واقعات اور ضرورتیں پیش آجاتی ہیں جن کی وجہ سے اس گرہ کا کھولنا لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ اس کی چند صورتیں ہیں:۔

(۱) علیحدگی کی خواہش دونوں طرف سے ہو۔

(۲) ایک ہی فریق معاہدہ توڑنے پر اصرار کرے۔

شریعت نے ہر موقع کے لئے ایسے قواعد مقرر کئے ہیں جن کی رو سے جدائی ممکن ہو جاتی ہے۔

مثلاً اگر نفرت و کراہت کا اظہار شوہر کی جانب سے ہو تو اسے طلاق کا اختیار ہے۔ اور اگر ناپسندیدگی زوجہ کی طرف سے ہو تو وہ خلع حاصل کر سکتی ہے ـــ نیز اگر نارضامندی میں دونوں شریک ہوں تو پھر ضابطہ مبارات کی سمت رجوع ہونا پڑے گا۔

ان میں سے ہر ایک کے لئے کچھ احکام بعض شرطیں اور خاص مواقع ہیں، جن کا اعتبار واجب ہے۔

اسلام چونکہ ایک اجتماعی دین ہے اور اس کی عمارت وحدت و یکتائی کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ اس مذہب کا سب سے بڑا مقصد محبت و اتفاق ہے۔ اس لئے اس

کی حدوں میں اِنتشار اور تفرقہ کو انتہائی مذموم سمجھا جاتا ہے۔

بنابریں اکثر روایات میں طلاق کی کراہت کا ذکر موجود ہے اور بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ

" حلالِ خدا میں طلاق سے زیادہ کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں!"

اسی واسطے شارعِ مقدس نے طلاق کے سلسلہ میں کچھ شرطیں لگا دیں اور بعض قیود عائد کر دیئے تاکہ اس نوع کے حادثے کم سے کم تعداد میں وقوع پذیر ہوں۔

چنانچہ امامیہ مذہب کے "احکامِ طلاق" میں شاہدین، عدلین کا ہونا شرطِ لازم ہے۔ اگر دو عادل گواہوں کے بغیر طلاق دی جائے گی تو وہ باطل متصور ہوگی۔

یہ شرط باہمی نفرت کو ختم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے کیونکہ نیک اور عادل نفوس کو معاشرہ میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کی شخصیت عام دلوں پر خاصا اثر کرتی ہے نیز گواہ جب اچھے صفات کے حامل ہوں گے تو وعظ و نصیحت اور صلح و صفائی کی جانب توجہ دینا اپنا فرض سمجھیں گے۔ ہاں!

یہ ضروری نہیں کہ ہر موقع پر ان کی کوششیں بار آور ہو جائیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس طریقہ سے فارغ خطی کے واقعات میں کافی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

مگر افسوس کہ برادرانِ اہلِ سنت نے اس سلسلہ پر دھیان نہیں دیا، اور انھوں نے طلاق کے لئے "شاہدین، عدلین" کی موجودگی کو لازم نہیں قرار دیا۔ نتیجہ ان کے ہاں طلاق کا دائرہ اتنا پھیلا کہ سخت مشکل آن پڑی۔

شریعت کے مقدس اور بلند مقاصد نیز اس کے تمدنی اسرار و رموز سے تقریباً سب ہی غافل ہیں، کاش مسلمان پوری تندہی کے ساتھ احکامِ ربانی پر عمل پیرا ہو سکیں۔ تاکہ کم از کم ان کی عائلی زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہو گئی ہیں، اور خانگی نظام میں جو ابتری پھیلی ہوئی ہے اس کا ارتفاع ہو جائے۔

دوسری بڑی شرط یہ ہے کہ طلاق دہندہ مجبور، مشتعل اور بے حواس نہ ہو۔ نیز طلاق پانے والی...... پاک ہو۔ اس طہر میں اس سے اختلاط نہ کیا گیا ہو۔

فقہ جعفری میں "طلاقِ ثلاث" ایک ہی طلاق تسلیم کی جاتی ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق دے دے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام نہیں ہوتی۔ بغیر محلّل کے اس کا رجوع کر لینا جائز ہے۔ البتہ اگر رجوع کے بعد پھر طلاق ہو جائے۔ اس کے بعد پھر رجوع اور پھر طلاق تو تیسری بار وہ حرام ہو جائے گی، اور پھر اُس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ کسی دُوسرے شخص سے نکاح نہ کرے۔ نیز اگر نو بار یہی عمل جاری رہے تو نویں مرتبہ حرامِ مؤبّد ہو جائے گی۔ یعنی اپنے پہلے خاوند کے لئے ہمیشہ کے لئے ناجائز قرار پائے گی۔

سوادِ اعظم کے بیشتر علماء نے "طلاقِ ثلاث" کے ضمن میں اختلاف فرمایا ہے۔ ان حضرات کے نقطۂ نظر سے کسی شوہر کا اپنی زوجہ سے یہ کہہ دینا کہ "میں نے تجھ کو تین مرتبہ طلاق دی" طلاقِ بائن ہے جس میں بغیر محلّل کے دوبارہ حلال ہونا ممکن نہیں۔ حالانکہ ان کے صحاح میں یہ صراحت موجود ہے کہ "طلاقِ ثلاث" طلاقِ واحد ہی کے مانند ہے۔ جیسا کہ بخاری میں جناب ابنِ عبّاس کی سند سے مذکور ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

"عہدِ رسالتؐ، دورِ ابوبکر اور حضرتِ عمر کی خلافت کے دو سال تک طلاقِ ثلاث طلاقِ واحد شمار ہوتی تھی۔ مگر حضرت عمرؓ نے کہا کہ جس مُعاملہ میں انتظار چاہیئے تھا، لوگوں نے اس میں جلد بازی شروع کر دی۔ پس اگر ہم اسے نافذ کر دیں، چنانچہ یہ رواج پا گیا۔"

اور خود قرآن مجید واشگاف لفظوں میں اعلان کر رہا ہے :

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ

"طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد یا تو قاعدہ کے مطابق روک لینا چاہیئے، اور یا پھر اچھے برتاؤ کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔"

(البقر۔ آیت : ۲۲۹)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ

"پس اگر تیسری دفعہ بھی طلاق (بائن) دے دے تو پھر جب تک دُوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔"

(البقرہ۔ آیت : ۲۳۰)

اسبابِ طلاق کی یہ ایک اجمالی بحث بھی تفصیل فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں جدائی کے کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً وہ عیوب و امراض جو موجبِ فسخ ہوتے ہیں۔ جیسے جنون، جذام اور عورتوں میں رتق و قرن کے عوارض نیز ظہار و ایلاء بھی فراق پیدا کرتے ہیں۔

عدّہ کے اقسام، وطی شبہ اور ملک یمین کی متعلقہ تفصیل بھی مبسوط ذخیروں میں نظر آئے گی۔

شوہر کے مرنے پر بیوی کے لئے مطلق طور پر عدہ واجب ہے خواہ وہ یائسہ صغیرہ اور غیر مدخولہ ہی کیوں نہ ہو لیکن طلاق میں ان تینوں صورتوں کے علاوہ واجب ہے۔

البتہ ناجائز ہم بستری (زنا) میں عدہ نہیں۔

عدۂ وفات کی مدت چار مہینے دس دن ہے اور حمل کی شکل میں "ابعد الاجلین" کا لحاظ کرنا پڑے گا یعنی وضعِ حمل یا عدۂ وفات میں جو مدت زیادہ ہو، اس کی پابندی لازم ہے۔

عدۂ طلاق کی میعاد تین پاکیزگیاں یا تین ماہ کا عرصہ، حاملہ کے لئے وضعِ حمل اور کنیز کے واسطے آزاد عورت کی نصف مدت مقرر ہے۔

طلاق اگر تین مرتبہ نہیں واقع ہوئی ہے اور خلع کی صورت بھی نہیں ہے تو عدہ کے دوران میں شوہر رجوع کر سکتا ہے مگر عدّہ کا زمانہ گذارنے کے بعد عورت کو اختیار حاصل ہے، اور اس شکل میں دوبارہ نکاح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہمارے ہاں رجوع کے سلسلے میں دو گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ طلاق میں اسے لازم قرار دیا گیا ہے لیکن مستحب ہے، نیز اس کے لئے خاص الفاظ استعمال کرنے کی بھی کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایسے الفاظ و اشارات ہی کافی ہیں جن سے منشا پورا ہو جائے۔

خلع و مبارات!

علاقۂ زوجیت اس وقت تک منقطع نہیں ہو سکتا جب تک دونوں فریق یا دونوں میں سے کوئی ایک ناپسندیدگی کا اظہار نہ کریں عموماً یہی جدائی کی علت ہوتی ہے۔

پس اگر نفرت صرف شوہر کی طرف سے ہے تو اس کے اختیار میں طلاق ہے، جس کے ذریعے اگر وہ چاہے تو چھٹکارہ حاصل کر سکتا ہے، اور اگر زوجہ کراہت کرتی ہے تو اس کیلئے

یہ قاعدہ ہے کہ وہ بطور فدیہ کچھ مال دے کر خواہ وہ زرِ مہر ہی کے برابر کیوں نہ ہو یا اس سے زیادہ کچھ ایصال کر کے مقررہ صیغہ جاری ہونے کے بعد آزاد ہو سکتی۔ اسے خلع کہتے ہیں۔ اس میں بھی طلاق کی تمام شرطوں کا التزام ہے اور مزید برآں یہ کہ مظاہرۂ نفرت عورت ہی کی طرف سے ہو اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔

جیسا کہ کلامِ باری میں ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

"پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یہ دونوں حدودِ خداوندی کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت مرد کو کچھ دے کر چھٹکارا (خلع) حاصل کر لے، تو اس میں دونوں کے لئے کوئی حرج نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔"

(البقرہ۔ آیت: ٢٢٩)

اِس آیت کے ذیل میں اہلِ بیتؑ کی تفسیر یہ ہے کہ زوجہ اپنے شوہر سے یہ کہنے لگ جائے کہ میں تیری قسم کا اعتبار نہیں کروں گی۔ تیرے بارے میں اللہ کے مقرر کئے ہوئے قانون کی پابندی نہیں کروں گی۔ ہم بستری کے لئے تیار نہیں ہوں گی،

اور تیرے گھر میں ناپسندیدہ عناصر کو جگہ دوں گی! ظاہر ہے کہ اِس سے انتہائی نفرت کا اعلان ہوتا ہے اور ملاپ کا کوئی امکان نہیں نظر آتا۔

لیکن اگر منافرت میں دونوں یکساں ہوں تو یہ مبارات کی شکل ہوگی۔ اس میں بھی طلاق کی تمام شرطوں کا پابند ہونا ضروری ہے۔ اس موقعہ پر شوہر کو زوجہ سے دیئے ہوئے زرِ مہر سے زاید مال لینے کا حق نہیں۔

خلع و مُبارات میں طلاق بائن ہوتی ہے، جس میں شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ البتہ فدیہ کے بعد عورت کو یہ حق پہنچتا ہے، ایسی صورت میں مرد چاہے تو قاعدہ کے مطابق عدہ کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

ظہار۔ ایلاء۔ لعان!

یہ اسباب بھی فی الجملہ تحریم کا باعث ہیں مگر اپنی خاص شرطوں کے ساتھ جو فقہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ چونکہ ایسے حادثے کم ظہور پذیر ہوتے ہیں، بنا بریں یہاں ان سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔

وراثت !

ایک مالک کے فوت ہونے سے دُوسرے کے نام اس کے متروکہ اموال کے منتقل ہونے کو اس نسبی یا سببی رشتہ کے باعث جو ان دونوں میں موجود ہو وراثت کہتے ہیں۔

زندہ قرابت دار وارث — متوفیٰ مورث — اور استحقاق — ارث — کہلاتا ہے۔ ایک شخص کا دُوسرے سے یا دونوں کا تیسرے سے متولد ہونا نسب ہے۔

اگر کسی وارث کا حق کتابِ الٰہی میں معین ہے تو وہ اس زمرے میں شمار ہوگا جو باعتبار فرض ورثہ پاتے ہیں۔ ورنہ وہ قرابت کے لحاظ سے ورثہ دار ہوگا۔ قرآن مجید میں منصوص حصے چھ ہیں۔ حصص اور حصہ داروں کی تشریح حسبِ ذیل ہے:

- نصف ($\frac{1}{2}$)۔ شوہر — بشرطیکہ زوجہ کا کوئی لڑکا نہ ہو، اکلوتی لڑکی اور بہن!
- ربع ($\frac{1}{4}$) ا۔ شوہر — جب زوجہ کا لڑکا موجود ہو۔
ب۔ زوجہ — بشرطیکہ شوہر کا فرزند نہ ہو۔

- ثمن ($\frac{1}{8}$) بیوی — لڑکے کی موجودگی میں۔
- ثلث ($\frac{1}{3}$) ماں — لڑکے اور مورث کے بھائیوں کے نہ ہونے کی صورت میں، نیز کلالہ مادری کے متعدد افراد۔
- دو ثلث ($\frac{2}{3}$) — دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں اور بہنوں کا بھی یہی حکم ہے، بشرطیکہ کوئی لڑکا نہ ہو۔
- سدس ($\frac{1}{6}$) ماں باپ میں سے ہر ایک — لڑکے کی موجودگی میں، نیز کلالہ مادری کا ایک فرد خواہ مرد ہو یا عورت۔

اور جو اِس جدول (چارٹ) میں نہیں آتے ہیں، وہ قرابت داری کی وجہ سے وارث ہوں گے۔

عورت کے مقابلے میں مرد کا حصہ دُگنا ہے۔

نسبی وارثوں کے تین ۳ طبقے ہیں:

۱۔ ماں، باپ، اولاد نیچے تک۔

۲۔ اجداد اُوپر تک، بھائی نیچے تک۔

۳۔ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ جو سب اولوالارحام ہیں۔ ان میں کوئی بھی صاحبِ فرض نہیں، اِس سلسلے میں کلی قاعدہ یہ ہے کہ قریب کی موجودگی میں بعید قطعاً وارث

نہیں ہو سکتا۔ یعنی نزدیکی قرابت دار کے ہوتے ہوئے دُور
کے رشتہ دار کو ورثہ نہیں ملے گا۔

فرقہ شیعہ اور اہلِ سنت کے درمیان سوائے عول
و تعصیب کے باقی مسائلِ وراثت میں چنداں اختلاف نہیں۔
امامیہ، فقہ میں اہلِ بیتؑ اطہار کے طریقوں سے
تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ وراثت میں نہ عول ہے
نہ تعصیب۔ اور یہی اعاظم صحابہ کا بھی مسلک تھا۔ چنانچہ
ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مشہور و معروف بیان
کو سنداً پیش کیا جا سکتا ہے جس میں آپ نے عول و تعصیب
کی نفی فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کافی دلائل موجود ہیں۔

حبوہ متوفی کے فرزند اکبر کا حصہ ہے۔ اس میں مورث
کے کپڑے۔ تلوار۔ قرآن اور انگشتری شامل ہے۔

زوجہ کو اراضی مزروعہ وغیر مزروعہ پر کوئی حق نہیں،
اسی طرح جائیداد غیر منقولہ میں سے اسے عمارتوں، اور
درختوں کی صرف قیمت (بقدر حصہ) ادا ہوگی۔ اصل پر قبضہ
نہیں دیا جائے گا۔ ان دو مسائل میں شیعہ منفرد ہیں،
اور آئمہ معصومینؑ کے اقوال سے ان نظریات کی تائید
ہوتی ہے۔

وقف ہبہ اور صدقات

وہ مال جو کسی کی ملکیت ہو اور پھر اسے وہ اپنے تصرف
سے نکالنا چاہے تو یا تو یہ اخراج مطلق حیثیت سے ہو گا۔
یعنی ---! جائیداد نہ صرف یہ کہ صاحبِ جائیداد کے قبضہ سے
خارج ہو جائے بلکہ قطعی طور پر ہر شخص کے لئے ناقابلِ ملکیت
بن جائے۔ جیسے غلام کو آزادی بخش دی یا کسی مکان و زمین،
کو ملکیت سے مجرد کر کے عبادت کدہ، مسجد یا زیارت گاہ بنا دیا
اس نوعیت کے اقدام سے کوئی جائیداد کبھی کسی سبب اور
وجہ سے کسی کی بھی دوبارہ ملکیت میں نہیں آسکتی۔

دُوسری شکل یہ کہ ملکیت سے الگ ہونے میں صرف یہ پہلو
ملحوظ رکھا جائے کہ وہ ایک مالک کے تصرف سے نکل کر
دُوسرے کے قبضہ میں چلی جائے۔ اب یہ عمل یا تو کسی مالی
معاہدے کے تحت یا مفاہمت کی بنیاد پر ہو گا۔ جیسے خرید و
فروخت، بیع وفا اور صلح وغیرہ اور یا پھر اس میں مالی معاوضہ
کا کوئی تصور نہیں ہو گا، دُوسری شکل میں اگر مقصد اجر و
ثواب و للّٰہیت ہے تو عام مفہوم میں اسے صدقہ کہیں گے
نیز اگر مال اس قسم کا ہے کہ قابلِ لحاظ مدت تک رہ سکے،

اور صدقہ دینے والے کی نیت بھی یہی ہو کہ مال رہے اور نفع اُمورِ خیر میں کام آئے تو یہ وقف کہلائے گا لیکن اگر مال رہنے کے قابل نہیں اور خیرات دہندہ نے اس کی بقاء کی شرط بھی نہیں لگائی ہے تو اسے خاص مفہوم میں صدقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر کسی شخص کو کسی اثاثے یا جائیداد کا مالک قرار دینے میں اجر و ثواب مقصود نہ ہو تو اسے ہبہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس بخشش کے مقابلے میں کوئی معاوضہ طلب کر لیا جائے تو یہ ہبہ عوض کی شکل ہوگی۔ جیسے کوئی آدمی دوسرے سے کہے کہ "میں تمھیں یہ کتاب ہبہ کرتا ہوں تم مجھے یہ کتاب ہبہ کر دو!" پس اگر طرفِ مقابل قبول کر لے تو لزوم عائد ہو جائے گا، اور فریقین میں سے کوئی بھی اپنا مال دوبارہ لینے کا مجاز نہیں۔ مگر یہ کہ دونوں دوبارہ قول و قرار فسخ کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ ہبہ کی تمام صورتوں میں قبضہ شرط ہے۔

ہبہ جائزہ میں یعنی جس میں کوئی معاوضہ نہ حاصل کیا گیا ہو، دی ہوئی چیز کا واپس لے لینا صحیح ہے۔ البتہ دی ہوئی چیز کا قرابت داروں (ذوی الارحام) شوہر یا زوجہ سے مانگنا جائز

نہیں۔ اسی طرح تلف شدہ مال کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قبضہ کے بعد صدقات کا واپس لینا بھی درست نہیں، بلکہ اگر قبضہ نہ بھی ہو جب بھی ان کی بازیافت جائز نہیں قرار دی جا سکتی۔

صیغۂ وقف جاری کرنے کے بعد جب جائیداد متولی یا جن کے لئے وقف کی گئی ہے، ان کے قبضہ میں دے دی جائے نیز اگر خود واقف بھی تولیت کے ارادہ سے وقف کردہ جائیداد پر متصرف ہو جائے تب بھی اسے دوبارہ واپس لینے، بیچنے، رہن رکھنے یا تقسیم کرنے کا حق نہیں رہتا۔ خواہ یہ وقف علی الاولاد ہی کیوں نہ ہو، جسے وقفِ خاص سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یا وقفِ عام ہو، جیسے غریبوں، ناداروں اور مساجد و مدارس کے نام موقوفہ جائیداد۔

البتہ چند خاص مواقع ایسے ہیں جہاں استثنائی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور وقف شدہ جائیداد کو فروخت کیا جا سکتا ہے، مثلاً

- وقف کا خراب ہو جانا، مگر خرابی کی وہ منزل جس میں اصل سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو۔!

• برباد ہونے کا شدید اندیشہ جس میں نفع کی صورت ختم ہوتی نظر آرہی ہو۔

• قابضوں کا ایسا اختلاف جس سے جان و مال اور عزت و آبرو کو گزند پہنچنے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔

مگر ان تمام حالات کے باوجود کسی شخص کو خود بیچنے یا حصے بخرے کرنے کا حق نہیں پہنچتا، بلکہ فیصلہ کا دارومدار حاکمِ شرع پر ہوگا۔ حاکمِ شریعت ہی کو اختیار ہے کہ وہ جملہ کوائف کا جائزہ لیکر مناسب حکم صادر کرے۔

لیکن افسوس کہ اوقاف کے سلسلہ میں لوگ انتہائی مساوات میں پڑگئے ہیں۔ حدودِ شریعت کا خیال نہیں رہا، اور مقررہ ضابطوں کی پروا نہیں کی جارہی ہے۔ بہرحال خداوندِ عالم سب کے عزم و عمل سے آگاہ ہے وهو اللطيف الخبير۔ یہ وقف کا مختصر سا بیان تھا۔ جسے شہرتِ عام حاصل ہے۔

مقدّمات کے فیصلے!

عہدۂ قضا اور نظامتِ عدل و انصاف کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور ہے بھی یہ انتہائی معزز رتبہ،

امامیہ مذہب میں عدلیہ کی ذمہ داری کو نبوت، امامت اور ریاستِ عامہ کا ایک شعبہ تصور کیا جاتا ہے۔
پروردگارِ عالم ارشاد فرماتا ہے:

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ [1] "اے داؤد، ہم نے تمھیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تم حق و انصاف کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کیا کرو"

دوسرا فرمان ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [2] "قسم ہے تمھارے رب کی (اے رسول) جب تک یہ لوگ آپس کے جھگڑوں میں بغیر کسی تنگ دلی کے تم کو حکم نہیں بنائیں گے، اور پوری طرح تمھارے فیصلے کو تسلیم نہیں کرلیں گے اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے"

قاضی اور حاکم نوامیسِ ثلاثہ یعنی جان، مال اور عزت

---

[1] سورۂ ص ۔ آیت: ۲۶

[2] سورۂ نساء ۔ آیت: ۶۵

کے خدائی امانت دار ہوتے ہیں، اسی لئے اس عہدہ میں
قدم قدم پر سخت خطرے لاحق رہتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے
میں حدیثوں کے مضمون پر غور کیا جائے تو کمال عظمت کو
دیکھ کر پہاڑ بھی ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام
فرماتے ہیں:

"قاضی کو جہنم کے کنارے پر سمجھنا چاہیئے
فیصلہ دینے والے کی زبان دو انگاروں کے
بیچ میں ہوتی ہے۔ اے شریح! تم ایسی جگہ
بیٹھے ہو جہاں نبی بیٹھتا ہے۔ یا اس کا وصی
اور یا پھر کوئی شقی۔"

حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے ـ "جسے قاضی بنا دیا گیا، اسے
گویا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔" اس قبیل کی اور بہت سی
روایتیں ہیں۔

فقیہ جس حکم کو دلائل سے مستنبط کرتا ہے، اگر وہ
کسی کلی موضوع سے متعلق ہے تو اسے فتویٰ کہیں گے،
جیسے بغیر اجازت کے دوسروں کے مال میں تصرف جائز
نہیں۔ شوہر کے لئے اس کی بیوی حلال ہے اور غیر مرد کے
واسطے حرام! لیکن اگر حکم کسی جزئی موضوع کے بارے

میں ہے تو اسے فیصلے اور قضا کا نام دیا جائے گا، جیسے
یہ زوجہ ہے وہ اجنبیہ ہے۔ یہ زید کا مال ہے۔ وہ فلاں کی
جائیداد ہے۔

فتویٰ ہو یا فیصلہ، یہ دونوں مجتہد عادل، اور
امام علیہ السلام کے نائب عام کے خصوصی فرائض ہیں فیصلہ
(قضا) جو فی الحقیقت کبھی موضوع کی تشخیص ہوتا ہے، یہ
خواہ مرافعہ اور مقدمہ کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر جیسے رویت
ہلال" اور "وقف و نسب" وغیرہ کے متعلق صدور حکم۔ بہر کیف
اس کے لئے غیر معمولی عقل و فہم اور ذکاوت و ذہانت درکار
ہے۔ بلکہ فتویٰ فیصلہ سے زیادہ مشکل کام ہے۔

اب اگر کوئی ایسا شخص اس کام کو انجام دینے لگے،
جس میں ان صفات کا فقدان ہو تو یقینی طور پر فائدہ سے
زیادہ نقصان پہنچے گا۔ بنا بریں امامیہ مذہب میں مجتہد
عادل کے سوا کسی اور شخص کے لئے اس کام کی انجام دہی
ناجائز قرار دی گئی ہے، بلکہ اسے گناہان کبیرہ میں شمار
کیا جاتا ہے، جس کی حدیں کفر سے جا ملتی ہیں۔

ہمارے اساتذۂ کرام اور اعاظم علمائے شیعہ حکم
نافذ کرنے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے چنانچہ ہمارا
بھی یہی شعار ہے۔

فیصلہ کا دار و مدار تین بنیادی امور پر ہوتا ہے۔

(۱) اقرار (۲) بیّنہ (۳) قسم۔ بیّنہ سے مراد دو عادل گواہ
ہیں۔

اختلاف و تعارض کے موقعوں پر تقدیم و ترجیح سے
کیونکر فائدہ اٹھایا جائے یہ قانونِ شہادت کی تفصیل طلب
شقیں ہیں جن کی تصریح کا موقعہ نہیں۔ اس عنوان پر ہمارے
فقہاء کی مستقل تصانیف موجود ہیں۔ اس عنوان پر ہم اپنی
کتاب "تحریر المجلّہ" کی چوتھی جلد میں بھی خاصی روشنی ڈال
چکے ہیں۔ حاکم جامع الشرائط کے حکم کو رد کرنے والا احکامِ
خداوندی کو رد کرنے والا متصور ہوگا۔ نیز جامع الشرائط حاکم
کے فیصلہ پر، کسی دوسرے کو نظرثانی کرنے کا حق نہیں، البتہ
وہ خود اپنے فیصلہ کا مکرّر جائزہ لے سکتا ہے۔

ذبح و شکار!

امامیہ کے نزدیک شریعت کا اساسی قاعدہ تو

یہ ہے کہ جانوروں کا کھانا مطلق طور پر ناجائز ہے (یعنی
کچھ شرطوں کے ساتھ جائز ہوتا ہے) اور خونِ جہندہ رکھنے
والے حیوانات موت سے نجس ہو جاتے ہیں۔ نیز جانوروں کی
دو قسمیں ہیں نجس العین، طاہر العین۔

نجس العین وہ جانور ہیں جن کی طہارت ناممکن،
اور بہر صورت ان کا کھانا حرام ہو۔ جیسے کتا اور سور۔

دوسری قسم کے حیوانات اگر بغیر شرعی تذکیہ کے
مر جائیں تو وہ بھی نجس العین ہوں گے اور ان کا استعمال بھی
مطلقاً حرام ہوگا۔ خواہ پرند ہوں۔ یا چرند جنگلی ہوں، یا
پالتو۔ اور خونِ جہندہ رکھتے ہوں یا نہ۔ لیکن اگر تذکیہ شرعی
سے مرے ہیں تو مطلق طور پر طاہر العین ہوں گے۔

درندے اور وحوش ناجائز ہیں۔ اگرچہ وہ پاک ہی
کیوں نہ ہوں۔

خونِ جہندہ رکھنے والے حیوانات کے تذکیہ کے
دو طریقے ہیں:

(۱) شکار۔ اس میں بھی حلال کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اس سدھائے ہوئے کتے کے ذریعہ شکار کیا جائے جو
حکم مانتا ہو اور اپنا شکار کھانے کا عادی نہ ہو، اس

میں یہ بھی شرط ہے کہ کتے کو شکار پر چھوڑنے والا، مسلمان ہو۔ اور چھوڑتے وقت اس نے اللہ کا نام لیا ہو نیز شکاری کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

(۲) تیر اندازی کے وسیلے شکار حاصل کیا جائے اس میں تلوار، نیزہ بلکہ تمام آلاتِ جارحہ اور لوہے کے۔ جملہ نوک دار ہتھیار شامل ہیں۔ بندوق کی گولی بھی (آہنی ہو یا کسی اور دھات کی) ان ہی میں شمار ہو گی۔

مگر شرط یہ کہ اس قسم کے حربے استعمال کرنے والا مسلمان ہو اور ہتھیار چلاتے وقت اُس نے اللہ کا نام لیا ہو، اگر سدھائے ہوئے کتے یا تیر و تفنگ سے شکار کا کام تمام ہو جائے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر صیّاد اپنے صید کو زندہ پالے تو اس کا تذکیہ کرنا چاہیئے، علاوہ ازیں دوسرے وسائل جیسے چیتے یا رسّی کے پھندے سے کیا ہوا شکار ناجائز ہے۔ البتہ اگر زندہ ہاتھ آجائے تو تذکیہ کے بعد جائز ہو گا۔

(ب) **شرعی ذبیحہ**: اس کے لئے ہمارے ہاں پہلی شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان یا مسلمانوں کے حکم میں ہو (جیسے کسی مسلمان کا لڑکا، یا کسی مسلمان کا ملا ہوا

بچہ) دوسری شرط یہ کہ امکان میں ہوتے ہوئے لوہے کے ہتھیار سے حلال کیا جائے۔ مگر ضرورت کے وقت ہر اُس چیز کا استعمال صحیح ہو گا جس سے معینہ رگیں کٹ جائیں۔ اللہ کا نام لینا بھی شرط ہے۔ قبلہ رُخ ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز "اوداجِ اربعہ" یعنی شہ رگوں اور نرخرے کا کٹنا لازمی ہے۔ البتہ اونٹ کے لئے ذبح کی جگہ نحر کافی ہے، اور باقی حیوانات کے سلسلہ میں اگر ذبح ناممکن ہو تو نحر کرنا جائز ہو گا۔ ان کے علاوہ وہ حیوانات جن میں خونِ جہندہ نہیں ہوتا، وہ سب حرام ہیں جیسے دریائی جانور کہ ان میں سوائے چھلکے والی مچھلی کے اور کوئی جائز نہیں۔ مچھلی اگر پانی کے باہر مر جائے تو اس کا تذکیہ ہو جاتا ہے۔

اس موقعہ پر ہمیں ایک پُر لطف واقعہ یاد آگیا۔ محمد ابن نعمان احول جنھیں "مومن طاق" کے نام سے شہرت حاصل ہے بیان فرماتے ہیں کہ۔ ایک دفعہ میں ابوحنیفہ کے پاس گیا، دیکھتا کیا ہوں کہ آپ کے آگے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور جب ان کی مجھ پر نظر پڑی تو کہنے لگے ___ "یہ کتابیں دیکھ رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں! سامنے ہیں!" ___ فرمانے لگے۔ "تمام کی تمام

طلاق کے موضوع پر ہیں؟" ـــــ میں نے کہا۔ اِس سلسلے میں کلامِ الٰہی کی ایک ہی آیت نے ہمیں آپ کی ان تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا ہے:" ـــــ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ [1]

اے رسولؐ! جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے ہنگام دو۔ اور عدت کا حساب رکھو۔"

یہ سُن کر آپ کہنے لگے۔ "اچھا تم نے اپنے دوست (امام جعفر صادقؑ) سے کبھی یہ بھی پوچھا کہ دریائی گائے کے متعلق ان کی کیا رائے ہے، اس کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟"

مومن طاق بیان کرتے ہیں۔ میں نے کہا "جی ہاں! حضرت کا ارشاد ہے:

"ہر چھلکوں والی چیز، خواہ وہ اُونٹ ہو، یا گائے، کھائی جا سکتی ہے۔ اور جس کے چھلکے نہ ہوں، اس کا کھانا حرام ہے۔"

[1] سورۂ طلاق - آیت ۱

خورد و نوش! ـــــ

حیوانات کی تین قسمیں ہیں: زمینی۔ آبی۔ ہوائی۔

یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ آبی جانوروں میں سوائے چھلکوں والی مچھلی کے اور کوئی چیز حلال نہیں۔ مچھلی کے انڈے بھی مچھلی ہی کے حکم میں ہیں۔

زمینی حیوانات میں پالتو مواشی، جنگلی گائیں، پہاڑی مینڈھے، نیز ہرن اور بارہ سنگھے جائز ہیں۔

گھوڑے۔ خچر اور گدھے مکروہ ہیں۔ نجاست کھانے والے جانور حرام ہیں۔ لیکن استبراء کے بعد کھائے جا سکتے ہیں۔

درندوں کی تمام قسمیں حرام ہیں۔ خرگوش۔ لومڑی۔ بجو اور نیولے وغیرہ یہ سب ناجائز ہیں۔ کیڑے مکوڑے، جیسے لال بیگ۔ کیچوے۔ سانپ۔ بچھو مطلقاً حرام ہیں۔

پرندوں میں درندگی کی صفت رکھنے والے طائر جیسے شکرے باز، بہری وغیرہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ علاوہ ازیں

شارعِ مقدس نے حلال پرندوں کی پہچان کے لئے تین حالات میں تین علامتیں قرار دی ہیں :

- طائر اگر فضا میں ہو تو اس کے پروں میں سکون سے زیادہ حرکت ہونا چاہیئے۔
- زمین پر ہو تو اس کے پیر میں خار کا ہونا ضروری ہے۔

ذبح شدہ حالت میں اگر پوٹا ہے تو وہ حلال ہوگا ورنہ حرام سمجھنا چاہیئے۔

چمگادڑ، مور، بھڑیں اور مماکھی یہ سب ناجائز ہیں۔
وہ کوّا[1] جو نباتات کھاتا ہو، جائز ہے، اور مُردار کھانے والا حرام ہے۔

حیوانات کے علاوہ ناجائز خورد و نوش کو چار کلیات میں منضبط کیا جاسکتا ہے :

۱۔ ہر غصب شدہ چیز کا استعمال حرام ہے۔
۲۔ ہر نجس شئی حرام ہے۔
۳۔ ہر مضر حرام ہے۔
۴۔ ہر خبیث حرام ہے۔

[1] یہ کوا ہمارے ملک میں نہیں ہوتا۔

سیّال اشیاء میں سب سے زیادہ شدید حرمت پیشاب کی ہے، اور اس سے بڑھ کر شراب ہے! نیز خمر، نبیذ، فقاع، عصیر (شراب کے جملہ اقسام) امامیہ مذہب میں مسکرات کی حرمت و نجاست کے سِلسلہ میں تمام اِسلامی فرقوں سے زیادہ سخت احکام ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں آئمۂ طاہرین علیہم السلام سے جو روایتیں ملتی ہیں ان کے مضامین دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کشید کرنے والے، ذخیرہ اندوز، فروخت کنندہ اور مے نوش ان تمام پر نفرین کی گئی ہے۔ ہماری شریعت میں اسے "اُمّ الخبائث" کہا جاتا ہے۔ اہلِ بیتؑ کی بعض حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میز پر بیٹھنا بھی حرام ہے جس پر مسکرات کو جگہ دی گئی ہو۔ غالباً اس میں راز یہ ہے کہ لوگ شدّت کے ساتھ ناجائز مشروبات سے پرہیز کریں — تاکہ خورد و نوش کی دُوسری اشیاء میں ان کی بُو باس اور اثرات سرایت نہ کرنے پائیں۔ علومِ جدیدہ کے ماہروں نے کیمیاوی تجربے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ شراب بُری بلا ہے: نہایت مضر، حد درجہ ہلاکت آفرین!

اسلام نے تیرہ سو سال پہلے ہی اِس حقیقت سے آگاہ کردیا تھا، چنانچہ آج وہ لوگ بھی اس سے کنارہ کش ہو رہے ہیں، جن کی شریعت اسے حرام قرار نہیں دیتی! شرعِ محمدیؐ کی کیا تعریف ہوسکتی ہے! جو لوگ اس کی پابندی نہیں کرتے، وہ خود کو تباہی میں ڈالتے ہیں۔

*** حُدود اور تعزیرات ****

اسلام نے تیرہ سو سال پہلے ہی اس حقیقت سے
آگاہ کر دیا تھا چنانچہ آج وہ لوگ بھی اس سے کنارہ کش ہو
رہے ہیں جو کسی شریعت نے اسے حرام قرار نہیں دیا تھی اشتراع
معاشرہ کا کیا اندیشہ ہو سکتی ہے بجز یہ کہ اس کی پابندی
نہیں کرتے وہ خود کو تباہی میں ڈالتے ہیں۔

★ حُدُود!

نظامِ اجتماعی کی حفاظت اور ہیئتِ انسانی کی صیانت کے لئے چند خاص جرائم کی یہ فوری سزائیں ہیں۔

★ حدِّ زنا!

ہر وہ بالغ و عاقل جو جانتے بوجھتے ہوئے کسی ناجائز عورت کے ساتھ جنسی اختلاط کرے گا، تو صاحبِ اختیار حاکم پر واجب ہوگا کہ اسے سو کوڑے لگائے —— نیز اس کا سر منڈوا کر ایک سال کے لئے شہر بدر کروا دے،

اور اگر زنائے محصنہ کا مرتکب ہوا ہے تو سنگسار کیا جائیگا پھر اگر عورت بھی راضی ہو تو شوہر دار ہونے کی صورت میں اس کو بھی یہی سزا ملے گی۔ ورنہ صرف سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے اپنی محرّماتِ نسبی، رضاعی یا سوتیلی ماں کے ساتھ ناجائز فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کوئی ذمّی کسی مسلمان خاتون سے زنا کرے، تو اسے قتل کیا جائے گا، زنا بالجبر کی بھی یہی سزا ہے۔

زنا کے ثبوت کے لئے مجرم کا چار مرتبہ اقبال کرنا یا چار عادل گواہوں کی شہادت ضروری ہے۔ تین مرد اور دو عورتیں بھی کافی ہیں۔ اور اگر دو مردوں اور چار عورتوں نے گواہی دی ہے۔ تو صرف کوڑے لگیں گے۔ سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ اس سے کم میں زنا کا ثبوت مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ نیز اگر دو یا تین آدمیوں نے شہادت دی تو انھیں قذف (تہمت) کی سزا دی جائے گی۔ گواہوں کی گواہی میں کامل اتفاق اور مشاہدہ شرط ہے۔

مجرم اگر سنگساری کے بموجب اقرار کر کے انکار کر جائے تو وہ حد ساقط ہو جائے گی، اور اگر اقرار کے بعد توبہ کرلے

تو حاکم کو اختیار ہے۔ نیز گواہیوں کے بعد توبہ کرنے سے حد ساقط نہیں ہوگی۔

دو دفعہ کا سزا یافتہ مجرم اگر تیسری مرتبہ ارتکاب جرم کرے گا تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ حاملہ پر وضعِ حمل تک، اور بیمار پر صحت مند ہونے تک حد جاری نہیں کی جاسکتی۔

★ لواط اور سحق کی سزائیں!

کسی جرم و گناہ کی اتنی سزا نہیں جتنی اس معصیت کے لئے قرار دی گئی ہے سوائے اس مقام کے اور کسی جگہ آگ سے جلانے کی اجازت نہیں! خلافِ "وضعِ فطری" عمل کرنے والے کے لئے حاکمِ وقت مفصلہ ذیل سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا تجویز کر سکتا ہے۔

قتل، سنگساری، بلندی سے گرا کر ہڈیاں چورا کر دینا آگ میں جلانا، مفعول اگر بالغ و با اختیار ہے تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی اور کمسن کے لئے تعزیری کارروائی ہوگی۔

لواطت کے ثبوت کے لئے بھی یہی شرطیں ہیں، جو زنا میں معتبر ہیں۔ اسی طرح سحق میں فاعلہ اور مفعولہ دونوں پر

سو سو کوڑوں کی حد جاری ہوگی، نیز شوہر دار ہونے کی صورت میں سنگساری کی سزا بھی بعید نہیں۔ دلالوں کے لئے پچھتر کوڑے مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں سر منڈوا کر شہر بدر بھی کیا جا گا۔
ثبوت کے لئے دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار کرنا کافی ہے۔

★ تہمت کی سزا

اگر کوئی شخص کسی عاقل و بالغ اور آزاد مسلمان پر کوئی ایسا الزام عائد کرے جس پر حد جاری ہو سکتی ہے۔ مثلاً زنا لواط اور شراب نوشی کی تہمت، تو اس جرم کی یاداش میں اسے اسی کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ قابلِ قبول ثبوت یا جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کی تصدیق سے حد ساقط ہو جائے گی۔ دو عادل گواہوں کی شہادت سے جرم صحیح سمجھا جائے گا۔ ناپسندیدہ خطاب مثلاً کسی کو فاسق، فاجر جذامی یا برصی کہنا بھی قابلِ تعزیر ہے۔ نیز وہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے یا چہاردہ معصومینؑ میں سے کسی کو سب و شتم کرے تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔

★ مسکر کی سزا

مے نوش یا عہدِ قدیم و جدید کی کوئی نشہ آور چیز استعمال کرنے والے کی حد ۸۰ کوڑے ہیں، جو ننگی پیٹھ اور شانے پر لگائے جائیں گے۔
تین دفعہ کا سزا یافتہ اگر چوتھی مرتبہ مرتکب جرم ہوگا تو قتل کیا جائے گا۔ شراب کو حلال سمجھنے والے کی بھی یہی سزا ہے۔ شراب بیچنے والا اگر اپنے پیشے سے تائب ہو جائے تو فبہا، ورنہ وہ بھی سزائے قتل کا مستحق ہوگا۔

★ چوری کی سزا

بالغ و عاقل شخص اگر کسی بند چیز کی چوری کرے جس کی قیمت ¼ مثقال خالص سونے کے مساوی ہو تو عدالت میں پیش ہوگا، اور دو مرتبہ اقرار یا بینہ کے بعد اس کے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیاں قطع کی جائیں گی، اور اگر وہ دوبارہ اس جرم کا مرتکب ہوا تو پھر قدم کے بیچ سے اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ تیسری دفعہ حبسِ دوام کی سزا دی جائے گی نیز اگر وہ زندان میں بھی سرقہ کرے گا تو پھر قتل ہوگا حد

جاری ہونے سے پہلے اگر اس نے کئی بار چوری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اس پر ایک ہی حد جاری ہوگی۔ بچے اور مجنون کے لئے حد نہیں تعزیر ہے۔ چور کو مطلق طور پر تاوان دینا پڑے گا۔ تاوان کے سلسلے میں ایک مرتبہ کا اقبال اور ایک عادل گواہ کی شہادت قسم کے ساتھ کافی ہے۔ بیٹے کا مال چُرانے پر باپ کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے لیکن برعکس اس کے بیٹے کے ہاتھ قطع ہوں گے۔

★ مُحارِب کی سزا!

شہر، صحرا یا دریا میں لوگوں کو ڈرانے، دھمکانے یا لوٹ مار کے ارادے سے ہتھیار دکھانے والے کو حاکمِ شرع حسبِ صوابدید قتل، پھانسی، ہاتھ کاٹنے، پیر قطع کرنے یا شہر بدری کی سزا دے سکتا ہے۔ خُداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ

"جو لوگ خدا اور رسُولِ خدا سے جنگ کرتے ہیں، دنیا میں فساد پھیلانے کی سعی کرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ یا تو انھیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ہاتھ پیر کاٹے جائیں اور یا پھر شہر بدر کر دیا جائے۔" [۱]

شہر بدری کی صورت میں مجرم کو جس علاقہ میں پابند کیا جائے، وہاں کے باشندوں کو تحریراً مطلع کر دینا چاہیئے۔ تاکہ لوگ اس کے ساتھ ترکِ موالات (سوشل بائیکاٹ) کریں، یہاں تک کہ وہ تائب ہو جائے۔

گھر پر حملہ کرنے والا چور (ڈاکو) بھی محارب ہے، یہ اگر قتل ہو جائے تو اس کا خون رائیگاں تصوّر ہوگا۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون کی عزّت یا بچّے پر حملہ کرے تو انھیں حفاظتِ خود اختیاری کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اگر حملہ آور مَر جائے تو اس کا خُون بھی رائیگاں جائے گا۔ ٹھگ، نوسَرباز اور جھُوٹے گواہ لائقِ تعزیر ہیں، حاکم مناسب سزا تجویز کر سکتا ہے۔

---

[۱] سورۂ مائدہ۔ آیت: ۳۳

★ مختلف سزائیں!

کسی چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنیوالا واجب التعزیر ہے۔ باز نہ آنے کی صورت میں مستوجبِ قتل ہوگا۔ ایسا چوپایہ جس کا گوشت کھایا جاتا ہو، بدفعلی سے اس کا گوشت حرام ہو جائے گا۔ بلکہ اس کی نسل کا گوشت بھی ناجائز ہوگا۔ اس کیلئے حکم یہ ہے کہ جانور کو ذبح کر کے جلا دیا جائے اور مالک کو قیمت دلوا دی جائے۔ مشتبہ جانور کو قرعہ اندازی کے ذریعہ نکالنا چاہیئے۔ لیکن جن حیوانات کا گوشت ناقابلِ خوردنی ہو، انھیں دوسرے شہر میں فروخت کر کے ان کی قیمت تصدق کر دینا چاہیئے۔ مال اگر مجرم کا نہیں ہے تو جس کا نقصان ہوا ہے، اس کے نقصان کی تلافی ضروری ہے۔ دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار کرنے سے جرم ثابت ہو جائے گا۔

میّت کے ساتھ جنسی بے راہ روی اختیار کرنے والے کے لئے وہی حکم ہے جو زندہ کے لئے ہے۔ بلکہ یہاں عقوبت زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ بیوی اور مملوکہ کی

صورت میں مناسب سزا دی جائے گی۔ اس کے ثبوت کیلئے بھی وہی شرائط ہیں جو زنا اور لواطت کے ہیں۔

استمناء بالید (جلق) کرنیوالا بھی لائقِ تعزیر ہے۔ ہر شخص ممکن طریقہ سے اپنی، اپنے مال، جائیداد اور متعلقین کے لئے مدافعت کر سکتا ہے، لیکن پہلے آسان اور پھر تدریجاً سخت ذرائع اختیار کرے۔

کسی کے گھر میں جھانکنے والے کو اگر گھر والوں نے سنگ و خشت کا نشانہ بنا دیا، اور اس ضرب سے اس کا کام تمام ہو گیا۔ تو اس کا خون رائیگاں سمجھا جائے گا۔

★ قصاص اور دیت

قتلِ ناحق ــــ سب سے بڑا گناہ اور عظیم ترین فساد ہے

جان بوجھ کر کسی مومن کو ہلاک کرنے کی سزا جہنم ہے جس سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا!

"وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا" [1]

جرم خواہ اِس حد تک ہو کہ کوئی جان تلف ہو جائے

[1] سورۂ نساء - آیت: ۹۳

یا اِس قدر کہ انسان کے جسم کا کوئی جزو ضائع ہو جائے بہر حال جُرم! جُرم ہے۔

قتل کی تین صُورتیں ہیں:

قتلِ عمد —— شبیہ عمد —— خطائے محض!

قتلِ عمد کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ شبیہ عمد کا یہ مطلب ہے کہ مجرم نے کوئی اقدام تو کیا ہو، مگر قتل کی نیّت نہ رکھتا ہو۔ مثلاً کسی کو تادیباً زدو کوب کی جائے اور وہ اس صدمہ سے مَر جائے یا کسی مریض کو کوئی دوا پلادی جائے اور وہ اس کا کام تمام کر دے۔

خطائے محض کا یہ مفہوم ہے کہ مقتول سے متعلق نہ ارادہ ہو نہ اقدام اور خون ہو جائے، جیسے کوئی شخص کسی پرندہ کو نشانہ بنا رہا ہو مگر غلطی سے انسان ہدف بَن جائے یا کوئی آدمی اپنی بندوق اٹھا رہا ہو، اور وہ چھوٹ کر کسی کو ہلاک کر دے۔

اس کی زیادہ واضح قسمیں سوئے ہوئے آدمی۔ بے خیال شخص، پاگل اور ناسمجھ بچّے کے افعال ہیں۔

ان تمام انواع میں براہِ راست۔ بالواسطہ اقدام، اور انفراد و اشتراک یکساں حکم رکھتے ہیں۔ قصاص کا تعلق صرف

قتلِ عمد سے ہے۔ شبیہ عمد اور قتل خطا میں دیت ادا کرنا پڑتی ہے۔ قصاص کے لئے مجرم کا بالغ و عاقل ہونا شرط ہے۔ بچّہ اور مجنون قابلِ قصاص نہیں ہیں۔ مقتول کیلئے بھی عقل و بلوغ ضروری ہے۔ چنانچہ اگر کوئی بالغ کسی نابالغ کا خون کر دے تو اس کے لئے قصاص کے بجائے دیت ہے۔ بعض قصاص کے بھی قائل ہیں۔ یہی کیفیت مجنون کی ہے۔

جزوی نقصان میں اختیار معتبر ہے۔ مگر ہلاکتِ نفس میں جبر و اکراہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ خوُن کے معاملے میں تقیہ ناجائز ہے۔ مقتول کا معصُوم النفس ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنی ایسا شخص نہ ہو، جسے قتل کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

مجرم رشتہ میں مقتول کا باپ دادا یا پَردادا بھی نہ ہو، کیونکہ آبا و اجداد سے بیٹے یا پوتے کے قتل کے سلسلہ میں قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ انھیں صِرف دیت ادا کرنا پڑے گی۔ مسلمان صِرف مُسلمان کے خون کی وجہ سے مستوجبِ قصاص ہوگا، اسی طرح آزاد سے صِرف آزاد کا قصاص لیا جائے گا۔

آزاد مُسلمان کا خوُں بہا یہ ہے۔ سو اُونٹ یا دو سو گائیں یا ایک ہزار بھیڑیں یا دو سو حُلّے، یا پھر ایک ہزار دینار،

جو پانچ سو ترکی پاؤنڈ کے مساوی ہوتے ہیں۔

اگر مقتول کے وارث دیت لینے پر راضی ہوجائیں تو قصاص ساقط ہوجائے گا، اور قاتل کو ایک سال کے اندر اندر دیت ادا کر دینا پڑے گی۔

- شبیہ عمد میں، خون بہا کی ادائیگی کے لئے دو سال کی مدت رکھی گئی ہے۔
- قتل خطا میں تین سال کی مدت ہے اور ہر سال ایک تہائی واجب الادا ہوگی۔

جزوی نقصانات، جیسے ہاتھ پیر کاٹ ڈالنا، یا آنکھ پھوڑ دینا وغیرہ۔ اس میں عمداً اقدام کرنے کا قصاص آنکھ کے بدلے آنکھ کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت ہے۔

خطا اور شبیہ عمد میں ہر عضو کے بدلے یا پوری دیت ادا کرنا پڑے گی یا نصف، یا نصف سے کم۔

اعضائے مفرد (طاق) جیسے ناک وغیرہ کی دیت پوری ہے اور جفت مثلاً آنکھیں، ہاتھ، پیر، ان میں سے ہر ایک کی نصف اور دونوں کی پوری دیت قابل ایصال ہوگی۔ شبیہ عمد میں دیت کا ذمہ دار خود مجرم ہے، اور خطائے محض میں متعلقین کو ادا کرنا چاہیئے۔ تفصیل کے لئے فقہ کی مبسوط کتابیں موجود

ہیں۔ چونکہ ہم انتہائی اختصار سے کام لے رہے ہیں اس لئے بہت سے ابواب کا تذکرہ نہیں کر سکے۔ پھر ہمارا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ کچھ جھلکیاں دکھا دی جائیں، اور اشاروں اشاروں میں بات ختم ہوجائے۔

اس کتاب میں جو کچھ بیان ہوا ہے اسے "امامیہ عقائد و مسلمات" کے صرف عناوین کی حیثیت حاصل ہے۔ شرح و بسط کے لئے ان اوراق میں گنجائش کہاں؟ ؎

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

اب فرمائیں علمائے دین اور عامۃ المسلمین کہ ہم نے جو حقائق پیش کئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی بھی جسے اسلام کی بربادی کا سبب کہا جاتے؟ یا یہ کہ کوئی بھی ایسا مسئلہ ہے جو یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور زردشتیت سے ماخوذ ہو؟ یا ان مباحث میں کوئی ایسا پہلو نظر آتا ہے، جو دین توحید کے بنیادی نظریات اور کتاب وسنت کے مخالف معلوم ہوتا ہو؟

خدارا انصاف کرو، اور بہتان تراشیوں سے باز آؤ۔

آخر میں ہماری دُعا ہے کہ برادرانِ اسلام شکوک و شبہات کی دُنیا سے نِکل کر قرآن کے پرچم کے سایہ میں ایک نظر آئیں، اور اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصِل کرنے میں کامیاب ہوں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب تک فرقہ وارانہ جھگڑوں کا خاتمہ نہیں ہوگا، اُس وقت تک عزّت کی سحر نمُود نہیں کر سکتی اللہ ہمیں باہمی رواداری کی توفیق عطا کرے، اور محبّت کے رِشتوں کو اِستحکام حاصِل ہو ۞

خاتمہ

مسئلہ بداء

اس مسئلہ کے ضمن میں بھی شیعوں کو بہت مطعون کیا جاتا ہے۔ غلط حاشیہ آرائی کرنے والے نظریۂ بدا کو مسخ کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شیعوں کے عقیدے میں خداوندِ عالم ایسے کام کر بیٹھتا ہے، جن کا اسے علم نہیں ہوتا۔ (معاذ اللہ) اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہو سکتی ہے؟ یہ تو کفرِ صریح ہے اکیونکہ اس سے ایک طرف تو ایزدِ متعال کی صفتِ علم کا انکار لازم آتا ہے، اور دوسری جانب وہ محلِ حوادث اور آماجگاہِ تغیرات قرار پاتا ہے جس سے شانِ وجوب کی نفی ہوتی ہے۔ امامیہ فرقہ ان واہی تواہی خیالات کی قطعاً نفی کرتا ہے، بلکہ کوئی اسلامی فرقہ بھی اس گمراہ کن فکر کے حق میں نہیں۔ البتہ تجسیم پر ایقان رکھنے والے بعض عناصر کی طرف ان خرافات کی نسبت دی جاتی ہے چنانچہ خدا کے بارے میں یہ ان ہی میں سے کسی کا قول ہے

اعفونی عن الفرج واللحیۃ واسئلونی عما شئتم

"بس داڑھی اور شرم گاہ کے بارے میں مجھے معاف
رکھو، اور باقی جو چاہو، پوچھ لو۔"

صحیح نظریہ بداء جس کے شیعہ قائل ہیں وہ تو آلِ محمد
کے اسرار و رموز میں شامل ہے۔ چنانچہ اہلِ بیتؑ کی
حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ:

انہ ماعبد اللہ بشیٔ مثل القول بالبداء و
انہ ماعرف اللہ حق معرفتہ من لم یعرفہ بالبداء

" اقرار بداء سے جس طرح فرض بندگی ادا ہوتا ہے
اِس طرح کسی اور چیز سے نہیں ہوتا جس نے بداء
کو دلیلِ عرفان نہیں بنایا۔ اسے اللہ کی پوری معرفت
نہیں حاصل ہوئی۔"

اِس مضمون کی اور بھی روایتیں ہیں۔ حقیقت یہ کہ علم کی دو قسمیں
ہیں۔ ایک وہ جس سے قدرت نے اپنے ملائکہ و رسل کو مالا مال
کیا ہے، اس دانش و آگہی کے مطابق یقینی طور پر وہی ہوگا
جو انھیں بتایا گیا ہے مگر دوسری قسم وہ ہے جس سے نہ کوئی
مقرب بارگاہ فرشتہ واقفِ بداء ہے اور نہ کوئی برگزیدہ نبی!،
بس وہی جانتا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق وہ تقدیم و تاخیر اور

محو و اثبات جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ علم کی وہ منزل ہے جسے
باری تعالیٰ نے امّ الکتاب سے تعبیر فرمایا ہے۔ یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا
یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ[1] ۝ اس سے معبودِ برحق
کی قدرتِ کاملہ، حکمتِ بالغہ اور اس کے مختارِ مطلق اور
فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو حیثیت فسخ کو
تشریع میں حاصل ہے وہی کیفیت تکوین میں بداء کی ہے
پس جس طرح تشریعی ضابطوں کی ترمیم، اضافے اور تغیر و
تبدل میں اس کی نامعلوم مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں، اسی طرح
تکوینی امور میں اخفاء و ابداء کا تعلق ان "اسرار و رموز" سے ہے
جن کے فہم و ادراک سے ہماری عقلیں قاصر ہیں۔

بداء کا ایک یہ عنوان بھی ہے کہ خاصانِ خدا کو ایک
بات کا علم ہوتا ہے۔ مگر اس کے شرائط و موانع کی اطلاع
نہیں ہوتی۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کو یہ تو معلوم تھا کہ دولھا شب
زفاف مر جائے گا، مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ واقعہ کے ظہور
پذیر ہونے کے لئے صدقہ نہ دینا شرط ہے۔ چنانچہ اتفاقاً
دولھا کی ماں نے خیرات دے دی اور وہ بچ گیا۔ جب یہ حقیقت

[1] سورۂ رعد۔ آیت: ۳۹

مسیحؑ کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے فرمایا، تم لوگوں نے اس کی طرف سے کچھ تصدق کر دیا ہوگا۔ صدقہ تمام بلاؤں کو رد کرتا ہے۔

اِس قسم کے اور نظائر بھی ہیں، ان مواقف کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو نفوسِ انسانی کی آزمائش ہو جاتی ہے، اور دوسری یہ کہ خوئے تسلیم پروان چڑھتی رہتی ہے۔ ذبحِ اسمٰعیلؑ کے سوال پر جناب ابراہیمؑ کا امتحان اس کی واضح دلیل ہے۔ نیز اگر بداء نہ ہو تو دُعا و تصدق، شفاعت و توسل اور انبیاء و اولیاء کی گریہ وزاری، نیز کمالِ اطاعت کے باوجود ان کے خوف و ہراس کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔ ہاں! ان ذواتِ مقدسہ کے لرزاں و ترساں ہونے کا سبب وہ علمِ مکنون و مخزون ہے جس سے کوئی آگاہ نہیں اور یہی بداء کا سرچشمہ ہے۔

بداء کے اقسام قضاء و قدر اور لوح محو و اثبات کی تفصیل مقصود ہو تو ہماری کتاب "الدین والاسلام" کی پہلی جلد کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اِس مجموعہ میں ہم نے شرح و بسط کے ساتھ ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

★ تقیّہ!

تقیّہ کے معاملے میں بھی شیعوں کو خوب خوب بدنام کیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی صرف اِس وجہ سے کہ عام اہلِ اسلام اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اگر نگاہِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شیعہ حضرات جس تقیہ کے قائل ہیں وہ صرف ان ہی سے مختص نہیں۔ بلکہ یہ ایک عقلی ضرورت اور فطری تقاضہ ہے۔

شریعتِ اسلامی کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں عقل و دانش کا توافق نہ دکھائی دے۔ ہر مسئلہ میں علم و خرد ساتھ ساتھ نظر آئیں گے۔

جبلّتِ بشری کا جائزہ لیجیے تو اقرار کرنا پڑے گا کہ ہر انسان اپنی جان کا بچاؤ کرتا ہے۔ جان بڑی پیاری ہوتی ہے، البتہ اگر عزت و وقار پر آنچ آنے لگے یا حفاظتِ حق کا معاملہ درمیان ہو تو پھر حد درجہ عزیز ہونے کے باوجود ہستی کی کوئی ہستی نہیں رہتی! لیکن اگر یہ امور نہ ہوں تو پھر کون ہوشمند ہوگا، جو جان جوکھوں میں ڈال کر جگ ہنسائی کروانے کے لئے

تیار ہو؟ اس کے علاوہ بے ضرورت تہلکہ میں پڑنا عقل و شرع
دونوں کے خلاف ہے۔

اسی لئے شارعِ مقدس نے اجازت دی ہے کہ وہ مسلمان
جو خطروں میں گھرا ہوا ہو، اور اس کی جان یا ناموس کو گزند پہنچنے
کا اندیشہ لاحق ہو وہ باطناً عمل کرتے ہوئے ظاہر بظاہر
اخفائے حق سے کام لے سکتا ہے۔

کلامِ الٰہی میں:

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً [1] اور اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ
قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ [2] سے یہی مقصود ہے۔ تاریخ
اسلام میں جناب عمار، ان کے والدین، نیز بعض دیگر اصحاب
کے واقعات موجود ہیں کہ کافروں کے ظلم سے مجبور ہو کر، وہ
اظہارِ کفر کر بیٹھے۔

تقیہ پر عمل کرنے کے تین احکام ہیں:

(۱) بے مقصد جان جا رہی ہو تو واجب ہے۔

(۲) اگر اظہارِ حق مفید مقصد ہو تو عمل اور ترکِ عمل
میں اختیار ہے۔

---

[1] سورۂ آلِ عمران - آیت: ۲۸
[2] سورۂ نحل - آیت: ۱۰۶

(۳) لیکن اگر باطل کو قوت پہنچے، اُمت گمراہ ہونے لگے
اور جور و ستم میں شدت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو
تو پھر تقیہ حرام ہے۔

آئیے! اب ہم اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں، تاکہ ہر
باضمیر انسان کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ تقیہ پر عمل پیرا
ہونے کے سلسلے میں غریب شیعہ قابلِ ملامت ہیں (بشرطیکہ
یہ عمل قابلِ ملامت ہو) یا وہ عناصر جنھوں نے ان کی آزادیاں
چھین کر تقیہ کے لئے مجبور کر دیا۔

امیر معاویہ نے غلبہ حاصل کرتے ہی شریعت کو کھلونا
بنا لیا تھا، اور ہاتھ دھو کر شیعیانِ علیؑ کے پیچھے پڑ گئے تھے
شیعوں کا خون پانی سے زیادہ سستا تھا۔

مروانی حکومت بھی اسی غلط سیاست پر کاربند
رہی۔ اس کے بعد عباسیوں کا دور آیا۔ انھوں نے مشقِ ستم
میں اور تیزی پیدا کر دی۔ نتیجتہً محبانِ اہلِ بیتؑ کو مختلف
موقف اختیار کرنا پڑے۔ کبھی چھپے، کبھی اُبھرے۔ گاہ ضرورتوں
نے انھیں مخفی رہنے پر مجبور کیا۔ اور کبھی حمایتِ حق کے جوش
میں سر سے کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے۔ تاکہ ان کے خون
کی دھاریں نشانِ منزل کا کام دیتی رہیں۔

چنانچہ بہت سے شیعہ اعاظم نے تقیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی اور دُنیائے ظلم کا مقابلہ کرکے خلعتِ شہادت زیبِ تن کیا۔ شہدائے مرج عذرا[1] کی داستان خاصی شہرت رکھتی ہے۔ یہ چودہ[14] جاں باز تھے جنھوں نے رسُولِ مقبُول کے مثالی عبادت گذار صحابی حُجر بن عدی کندی کی قیادت میں اپنی جانیں جانِ آفریں کے سپرد کر دیں۔

حُجر ابنِ عدی فتحِ شام کے نامور فوجی رہنما بھی تھے، امیر معاویہ کے الفاظ ہیں ـــــ "مرج عذرا میں' میں نے جن لوگوں کو تہہِ تیغ کیا ہے' ان میں سے ہر ایک کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ اس میں کیا نقص تھا، اور کیوں قتل ہُوا؟"

مگر حُجر کے بارے میں لاجواب ہونا پڑتا ہے کہ آخر میں نے انھیں کس جرم میں شہید کیا؟

ہاں! ہم بتاتے ہیں کہ حُجر کا کیا قصُور تھا؟ اس شہید نے تقیہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور صرف اس لئے کہ آلِ اُمیہ کا ستم عالم آشکارا ہو جائے۔ اور دُنیا کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اِس گھرانے کو دِین سے کتنا تعلق تھا!

نیز صحابیِ جلیل عمرو ابن حمق خزاعی اور عبدالرحمن ابن حسّان

[1] مرج عذرا شام کے ایک قریہ کا نام ہے۔

عنزی کا واقعہ کسے نہیں یاد، ابنِ زیاد نے انھیں زندہ دفن کرا دیا تھا۔

میثم تمار۔ رشید ہجری اور عبداللہ ابن یقطر کو دار پر کھینچوایا گیا۔ یہ اور ان کی طرح سینکڑوں مجاہدوں کی مثالیں ہیں جنھوں نے راہِ حق میں باطل کی صفوں سے ٹکرا لے کر انھیں پاش پاش کر دیا۔

ان حقیقت پسندوں نے تقیہ پر عمل نہیں کیا کیونکہ ان کے وقت کا یہی تقاضہ تھا۔ ان کے عدم تقیہ نے بقیہ حق کی حفاظت کر لی۔ اور اسلام کو معاویہ۔ یزید۔ زیاد اور ابنِ زیاد کے مذہب
و مسلک سے ممتاز کر دیا۔ ۱

حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کے ماجرائے شہادت کو کون بھول سکتا ہے؟ یہ شہیدوں کے قائد اور حریت پسندوں کے سردار تھے۔

ہاں! ان بزرگوں کو جن حالات سے سابقہ تھا۔ ان کے پیشِ نظر یہ تقیہ کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر کچھ وقت ایسے بھی آئے ہیں جب تقیہ پر عمل واجب اور بعض دفعہ اختیاری فعل تصوّر کیا گیا۔

خیال پڑتا ہے کہ بعض مرویات میں وارد ہُوا ہے، کہ مسیلمہ کذاب نے دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ اور انھیں اپنی نبوت کی تصدیق اور آنحضرتؐ کی رسالت کی تکذیب پر مجبور

کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے تو اس کی خواہش مسترد کر دی نتیجۃً قتل ہو گیا، مگر دوسرے نے اس کی بات پوری کر کے رہائی حاصل کر لی۔

یہ خبر جب سرکارِ رسالتؐ تک پہنچی تو حضرتؐ نے فرمایا:

"پہلے نے جنّت کی راہ اختیار کرنے میں جلدی کی اور دوسرے نے مہلت طلب کر لی! — دونوں میں سے ہر ایک کو اس کا اجر ملے گا۔"

مسلمانو! تقیہ کے بارے میں اپنے بھائیوں کو مطعون نہ کرو۔ خدا ہماری تمھاری عاقبت بخیر کرے، اور رشد و ہدایت کے نقطہ پر اتفاق نصیب ہو۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ